ماہنامہ
نقیبِ ختمِ نبوت ملتان

۲ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ فروری ۲۰۰۸ء

بیاد
امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

- شہادت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ
- ''میراج پھٹنے کو ہے.....''
- اسلام کا تصورِ ریاست
- آزمائش کی گھڑی

نورِ ہدایت

القرآن

’’جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا، وہ مرے ہوئے نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے۔ جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے بخش رکھا ہے، اس میں خوش ہیں اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے اور (شہید ہو کر) ان میں شامل نہیں ہو سکے ان کی نسبت خوشیاں منا رہے ہیں کہ (قیامت کے دن) ان کو بھی نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے۔ اور اللہ کے انعام اور فضل سے خوش ہو رہے ہیں اور اس سے کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔‘‘

(آل عمران، ۱۷۱، ۱۶۷)

الحدیث

’’امام ترمذیؒ نے سیدنا اسامہ بن زیدؓ کی حدیث ذکر کی ہے کہ میں کسی ضرورت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے باہر اس حال میں تشریف لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کولہوں پر (یعنی گود میں) کچھ رکھے ہوئے تھے اور چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ جب میں اپنے کام سے فارغ ہوا تو عرض کیا یہ کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر ہٹائی، میں نے دیکھا کہ ایک جانب حسنؓ اور دوسری جانب حسینؓ ہیں اور فرمایا: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی ان سے محبت فرمایئے اور جو ان سے محبت کرے، اس کو بھی اپنا محبوب بنا لیجیے۔‘‘

(مناقب الحسن والحسین، ترمذی، ص ۲۱۸)

الآثار

صحابہ کرامؓ پر تنقید

’’یہ مؤرخین کی روایات تو عموماً بے سروپا ہوتی ہیں، نہ راویوں کا پتا چلتا ہے اور نہ ان کی توثیق وتخریج کی خبر ہوتی ہے اور نہ اتصال وانقطاع سے بحث ہوتی ہے اور اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام بھی کیا ہے تو عموماً اس میں غث وثمین سے اور ارسال وانقطاع سے کام لیا گیا ہے۔ خواہ ابن اثیر ہو یا ابن قتیبہ، ابن ابی الحدید ہو یا ابن سعد، ان اخبار کو مستفاض ومتواتر قرار دینا بالکل غلط ہے اور بے موقع ہے۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے متعلق ان قطعی اور متواتر نصوص اور دلائل عقلیہ ونقلیہ کی موجودگی میں اگر روایات صحیحہ احادیث کی موجود ہوتیں تو وہ بھی مؤوّل یا مردود قرار دی جاتیں۔ چہ جائیکہ روایاتِ تاریخ!‘‘

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ

(مکتوباتِ شیخ الاسلام، جلد ا، ص ۲۶۶)

نورِ ہدایت

القرآن

''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا، وہ مرے ہوئے نہیں بلکہ اللہ کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے۔ جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے بخش رکھا ہے، اس میں خوش ہیں اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے اور (شہید ہوکر) ان میں شامل نہیں ہوسکے ان کی نسبت خوشیاں منا رہے ہیں کہ (قیامت کے دن) ان کو بھی نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غم ناک ہوں گے ۔اور اللہ کے انعام اور فضل سے خوش ہورہے ہیں اور اس سے کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

(آل عمران، ۱۷۱، ۱۶۷)

الحدیث

''امام ترمذیؒ نے سیدنا اسامہ بن زیدؓ کی حدیث ذکر کی ہے کہ میں کسی ضرورت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے باہر اس حال میں تشریف لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کولہوں پر (یعنی گود میں) کچھ رکھے ہوئے تھے اور چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ جب میں اپنے کام سے فارغ ہوا تو عرض کیا یہ کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر ہٹائی، میں نے دیکھا کہ ایک جانب حسنؓ اور دوسری جانب حسینؓ ہیں اور فرمایا: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، آپ بھی ان سے محبت فرمائیے اور جو ان سے محبت کرے، اس کو بھی اپنا محبوب بنالیجیے۔''

(مناقب الحسن والحسین، ترمذی، ص ۲۱۸)

صحابہ کرامؓ پر تنقید

''یہ مؤرخین کی روایات تو عموماً بے سروپا ہوتی ہیں، نہ راویوں کا پتا چلتا ہے اور نہ ان کی توثیق وتخریج کی خبر ہوتی ہے اور نہ اتصال وانقطاع سے بحث ہوتی ہے اور اگر بعض متقدمین نے سند کا التزام بھی کیا ہے تو عموماً اس میں غث وثمین سے اور ارسال وانقطاع سے کام لیا گیا ہے۔ خواہ ابن اثیر ہو یا ابن قتیبہ، ابن ابی الحدید ہو یا ابن سعد، ان اخبار کو مستفاض ومتواتر قرار دینا بالکل غلط ہے اور بے موقع ہے۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کے متعلق ان قطعی اور متواتر نصوص اور دلائل عقلیہ ونقلیہ کی موجودگی میں اگر روایات صحیحہ احادیث کی موجود ہوتیں تو وہ بھی مؤوّل یا مردود قرار دی جاتیں۔ چہ جائیکہ روایاتِ تاریخ!''

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ

(مکتوبات شیخ الاسلام، جلد ۱، ص ۲۶۶)

دل کی بات　　مدیر

جنابِ صدر! ضد چھوڑیئے، گھر جایئے

وطنِ عزیز حسبِ معمول شدید سیاسی، معاشی اور اقتصادی بحرانوں کے بھنور میں گھرا ہوا ہے۔ ہر طرف بدامنی، بداخلاقی، مذہب بیزاری اور قتل و غارت گری کے طوفان چل رہے ہیں۔ صوبہ سرحد کے درہ آدم خیل، سوات اور وزیرستان میں سرچ آپریشن شروع ہے۔ عوام بھی مر رہے ہیں اور فوج کے ساتھ دیگر سیکورٹی فورسز کے اہلکار بھی۔ بلوچستان میں تعصب و علیحدگی کی آگ بھڑک رہی ہے، سندھ میں نفرت و غصے کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور چودھریوں کے دھماکہ خیز پنجاب میں بم دھماکے ہو رہے ہیں۔ پورے ملک میں آٹا غائب ہے، گیس اور بجلی کی غیر علانیہ اذیت ناک لوڈشیڈنگ ہے۔ نگران وزیر خوراک کا بیان آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ ''آٹے کے بحران کے ذمہ دار عوام ہیں۔''

امریکہ کے محبوب ترین پاکستانی صدر مسٹر پرویز مشرف ان حالات میں یورپ کے سیر سپاٹے کر رہے ہیں۔ صدر پرویز نے اپنے حالیہ دورۂ یورپ میں اعتراف کیا کہ ''ان کی مقبولیت میں کمی ہوئی ہے'' پھر اقتدار پر قابض رہنے کا آخر کیا جواز ہے؟

اِدھر ریٹائرڈ جرنیلوں کی غیر سرکاری تنظیم کے رہنماؤں، سابق آرمی چیف مرزا محمد اسلم بیگ، حمید گل، فیض علی چشتی، اصغر خان، نور خان اور دیگر جرنیلوں نے متفقہ طور پر صدر سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ملک کے وسیع تر مفاد میں مستعفی ہو جائیں اور اقتدار عوامی قیادت کے سپرد کر دیں۔ صدر پرویز نے اُن کے جواب میں جو زبان استعمال کی ہے، وہ بھی اُن کے زوال اور واپسی کی غماز ہے۔ انھوں نے کہا کہ: جن جرنیلوں کو کچھ نہیں ملا وہ میرے خلاف بول رہے ہیں۔ یہ میرے شاگرد رہے ہیں، میں نے انھیں کک آؤٹ کیا..... وغیرہ وغیرہ۔ جنرل اسلم بیگ، اصغر خان اور فیض علی چشتی نے جواباً کہا کہ ''ہم نہ تو ان کے شاگرد رہے اور نہ ماتحت۔ بلکہ پرویز صاحب ہمارے ماتحت اور شاگرد تھے۔ انھوں نے خاندان اور ماں باپ کو گالیاں دی ہیں۔'' جو لوگ اپنی روشن خیالی سے مجبور ہو کر پرویز مشرف کی حمایت کرتے تھے، اب تو وہ بھی کہتے ہیں کہ پرویز صاحب چلے جائیں۔

نئے آرمی چیف جنرل پرویز کیانی نے فوج کو ہدایت کی ہے کہ سیاست اور سیاسی شخصیات سے دور رہے۔ صرف اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ اے کاش! یہ بات پرویز مشرف کو سمجھ آ جاتی۔ انھوں نے اپنی غلط خارجہ و داخلہ پالیسیوں سے ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

صدر پرویز زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھیں۔ آخر انھیں جانا ہے۔ وہ ضد چھوڑ دیں اور عزت سے گھر چلے جائیں، اب اُن کا اقتدار میں رہنا ملک کے مفاد میں ہے نہ عوام کے مفاد میں، ورنہ.....

جی کا جانا ٹھہر گیا ہے
صبح گیا یا شام گیا

حضرت سید نفیس الحسینی مدظلہ سے امیر احرار کی ملاقات

عبداللطیف خالد چیمہ

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی نائب امیر اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز حضرت سید انور حسین شاہ صاحب (سید نفیس الحسینی) مدظلہ العالی گزشتہ کچھ عرصہ سے شدید علیل ہیں اور کان کے مرض کی وجہ سے اب بہت نحیف بھی ہو چکے ہیں اور زیر علاج ہیں۔ حضرت شاہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے بہت ہی قابل احترام بزرگوں کی یادگار ہیں اور حضرت اقدس رائے پوری رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت سے پوری دنیا میں ان کا وسیع حلقۂ ارادت ہے اور ایک دنیا ان سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ مجلس احرار اسلام کے امیر ابن امیر شریعت، حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ العالی (خلیفۂ مجاز حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوری رحمہ اللہ)، مجلس کے مرکزی ناظم نشریات جناب عبداللطیف خالد چیمہ اور دیگر احرار کارکن لاہور جماعت کے ذمہ دار اور حضرت سید نفیس الحسینی مدظلہ العالی کے مرید خاص جناب ملک محمد یوسف کی معیت میں ۲۷ر جنوری جمعرات کو بعد نماز مغرب حضرت سید نفیس الحسینی مدظلہ العالی کی خدمت میں ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت پیر جی مدظلہ ایک طویل عرصے کے بعد حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے لہٰذا دونوں بزرگوں کی ملاقات والتفات اور باہمی دعاؤں کا منظر متعدد لوگوں نے دیکھا جو واقعتاً دیدنی تھا اور ہمارے اکابر کے طریقے کے عین مطابق حضرت سید نفیس الحسینی نے حضرت پیر جی مدظلہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ حضرت سید نفیس الحسینی مدظلہ نے شاہ صاحب کے جانے کے بعد فرمایا: ''میں نے خواب دیکھا تھا کہ ''پیر جی'' میری صحت یابی کی دعاء فرما رہے ہیں۔ آج اُن کی تشریف آوری اس خواب کی تعبیر ہے۔'' حضرت پیر جی کے آنے سے اُن کی طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی اور اُن کے جانے کے بعد دیر تک انھیں یاد کرتے رہے۔ حضرت سید نفیس الحسینی مدظلہ اور حضرت سید عطاء المہیمن بخاری دامت برکاتہم دونوں بزرگ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ سے بیعت ہیں۔ دونوں کو حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں رہ کر فیض پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت سید نفیس الحسینی مدظلہ، حضرت رائے پوریؒ کے خلیفۂ مجاز ہیں، جب کہ حضرت سید عطاء المہیمن بخاری دامت برکاتہم، حضرت رائے پوریؒ کے خلفاء حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ اور حضرت مولانا ڈاکٹر محمد حسین للہیؒ، دونوں کے خلیفۂ مجاز ہیں۔

اللہ تعالیٰ دونوں بزرگوں کا سایہ ہم پر قائم رکھیں، اُن کی سرپرستی اور دعاؤں میں ہمیں تحفظ ختم نبوت کے مشن کے لیے جدوجہد تیز کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔ تمام قارئین اور احباب جماعت سے درخواست ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی صحت کاملہ اور عافیت کے لیے خصوصی دعاؤں کا اہتمام فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحب کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھیں اور ہم سب اُن سے مستفید ہوتے رہیں۔ (آمین یارب العالمین)

علاماتِ ایمان اوران کی حلاوت

درسِ حدیث

مولانا عبداللطیف مدنی

حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ اللَّيْثُ عَنْ اَبِی الْهَادِ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ بْنِ الْحَارِثِ عَنْ عَامِرِ بْنِ سَعْدٍ عَنِ الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِا للّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ .

ترجمہ: ''حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھا جو راضی ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر۔''

تشریح: اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کی تقدیر پر راضی رہے۔ رنج وتکلیف اور مصیبت میں اس کا گلہ شکوہ نہ کرے اور دین اسلام پر راضی ہونے کی علامت یہ ہے کہ اسلام کے احکام پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو۔ کفر وجاہلیت کے رسم ورواج کے قریب نہ بھٹکے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری پر راضی ہونے کی پہچان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اختیار کرے اور بدعت سے نفرت رکھے اور جس کو یہ بات حاصل نہیں، اسے ایمان کے مزے کی خبر نہیں۔

حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِیْ عُمَرَ نَا عَبْدُ الْوَهَّابِ الثَّقَفِیُّ عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ اَبِیْ قِلَابَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِی الْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُقْذَفَ فِی النَّارِ هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ وَقَدْ رَوَاهُ قَتَادَةُ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت (مزہ) پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت سب سے زیادہ ہو، دوسرا یہ کہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے کسی سے دوستی رکھے، تیسرا یہ کہ اس کو دوبارہ کافر بننا اتنا ناگوار ہو جیسے آگ میں ڈالا جانا۔

تشریح: حدیث شریف میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دوسری تمام چیزوں کی محبت پر غالب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی محبت تو اس لیے کہ وہی خالق ومالک ومنعم حقیقی ہے نیز محبت کے جتنے اسباب ہیں، جمال، کمال، احسان اور قرب سب اللہ میں پورے طور پر موجود ہیں اور سب سے زیادہ اللہ میں جمع ہیں۔ جمال، کمال اور احسان کا کامل ہونا تو ظاہر ہے محتاجِ بیان نہیں رہا۔ قرب تو اس کے لیے قرآن کریم کی شہادت کافی ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (سورۃ ق)۔ ''ہم شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔''

هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (سورۃ حدید)۔ ''اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔''

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِن لَا تُبْصِرُوْن (سورۃ واقعہ)

''اور ہم اس کے زیادہ قریب ہیں تمہاری نسبت لیکن تم نہیں دیکھتے۔''

اللہ کے بہت قریب ہونے کا مطلب:

اللہ کے بہت قریب ہونے کا مطلب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ایک مثال دے کر سمجھایا ہے کہ مثلاً یہ دھوپ ہے جس میں گرمی بھی ہے اور روشنی بھی ہیں۔ فرض کرو اگر یہ دھوپ خود اپنی حقیقت کو معلوم کرنا چاہے اور اس سلسلہ میں حرکتِ فکریہ کرے تو اس حرکتِ فکریہ میں سب سے پہلے شمس پڑے گا اور اس کو یہ سمجھنا ہوگا کہ میں ایک حصہ اور ٹکڑا ہوں۔ اس نور کا جو سورج کی ٹکیہ میں بھرا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ شمس کی حقیقت معلوم کرنے کے بعد وہ اپنی حقیقت معلوم کر سکتی ہے اور حرکتِ فکریہ میں شمس پہلے آیا اور اس کو اپنی حقیقت بعد میں آئے گی۔ معلوم ہوا کہ شمس دھوپ سے اس کی اپنی ذات وحقیقت سے بھی زیادہ قریب ہے۔ کیوں کہ حرکت میں جو چیز پہلے آئے وہی قریب ہے اور جو بعد میں آئے وہی بعید ہے۔ مثلاً تم ایک جگہ سے حرکت کر کے دور کے مقام پر چلنا چاہتے ہو۔ اس حرکت میں جو مقامات تم کو پیش آئیں گے وہ مقامات تمہارے زیادہ قریب ہیں بہ نسبت اس مقام کے جہاں تم جانا چاہتے ہو۔ فرق یہ ہے کہ اس میں حرکت عینی ہے اور اس میں حرکتِ فکریہ تھی۔ کلی طور پر اتنی بات سمجھ لیں کہ معلول اگر اپنی حقیقت کو سمجھنا چاہے اور حرکتِ فکریہ کرے تو اس حرکت میں پہلے علّت آئے گی۔ اس کے بعد معلول ایسے نفس اور حقیقت کو سمجھ سکے گا۔ پس اگر ممکنات مثلاً ہم اپنی حقیقت کو سمجھنا چاہیں گے تو پہلے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو معلوم کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ ہم معلول ہیں اور وہ علت ہے۔ ہمارا وجود ایک پرتو اور شعبہ ہے۔ اس کے وجود کا اور میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ حرکت میں جو پہلے آئے وہ قریب ہے اور جو بعد میں آئے وہ بعید ہے تو اللہ تعالیٰ ہمارے نفس اور ہماری حقیقت کی بہ نسبت ہم سے زیادہ قریب ہوا اور اسی طرز وطریقہ پر النبی اولی (ای اقرب) بالمومنین من انفسہم (احزاب) کہا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ مومن من حیث ہو مومن۔ اگر اپنی حقیقت کو سمجھنے کے لیے حرکتِ فکری کرے تو اپنی ایمانی ہستی سے پیشتر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل کرنی پڑے گی۔ اس اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ نبی کا وجود خود ہماری ہستی سے بھی زیادہ ہم سے نزدیک ہے۔

ان تمام چیزوں میں سے دوسری چیز یہ ہے کہ جس شخص سے بھی محبت رکھے محض اللہ تعالیٰ کے لیے رکھے یعنی نہ تو دنیوی جلب منفعت مقصود ہو اور دفع مضرت۔ مثلاً کوئی شخص اسباب محبت میں سے (جمال، کمال، احسان اور قرب) کسی وصف سے بظاہر متصف نہ ہو لیکن متقی اور متبع شریعت ہو۔ اسی وجہ سے اس کے ساتھ محبت ہو تو یہ محبت خالص اللہ کے لیے ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلے جملہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس سے تعلق کا بیان تھا۔ اور دوسرے جملہ میں مخلوق سے تعلق اور محبت کا ذکر ہے۔ گویا یوں فرمایا گیا کہ کامل مومن وہ ہے جو ان تمام تعلقات کا حق ادا کرے۔ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کا بھی اہتمام کرے۔ جب انسان میں یہ دونوں وصف کامل ہو جائیں گے تو لازماً اسے ہر اس چیز سے نفرت ہوگی

جو اللہ ورسول اور صلحا ومومنین کے نزدیک مبغوض ہے۔اس لیے اسے دوبارہ کافر بننا اتنا ناگوار ہونا چاہیے جتنا آگ میں ڈالا جانا بلکہ اس سے زیادہ۔اس لیے کہ کسی سے محبت اس کے دشمن سے بغض کو لازم ہے اور یہ تیسری چیز کا بیان ہے۔

حلاوتِ ایمان سے کیا مراد ہے؟

حلاوتِ حسی یا حلاوتِ معنوی؟ اکثر شُرَاح فرماتے ہیں کہ حلاوت معنوی وقلبی مراد ہے کیونکہ ایمان کوئی حسی چیز نہیں ہے کہ اس کی حلاوت مراد ہو یعنی طاعت وعبادت میں دل کو شیرینی جیسی حلاوت محسوس ہو جیسا کہ قطب الاقطاب حضرت گنگوہیؒ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا جو حضرت نے اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی خدمت میں لکھا تھا کہ بندہ کو بحمداللہ تین چیزیں حاصل ہیں جو محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔پہلی چیز ہے کہ اطراف واکناف میں دوسو سے زائد طالب علم مجھ سے حدیث شریف پڑھ کر اپنی اپنی جگہ درس دے رہے ہیں۔دوسری چیز یہ ہے کہ امور شرعیہ اموطبیعیہ کی مانند بن گئے ہیں یعنی امور شرعیہ کو چھوڑنے میں ویسی ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے جیسی کہ بھوک، پیاس اور دھوپ سے طبعاً تکلیف ہوتی ہے اور امور شرعیہ کی طرف ویسی ہی رغبت ہوتی ہے۔جیسی کہ انسان کو بھوک کے وقت روٹی کی طرف اور پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً میلان ہوتا ہے۔تیسری چیز یہ کہ مادح اور ذام (یعنی تعریف اور مذمت کرنے والے) دونوں برابر معلوم ہوتے ہیں۔یہ دوسری چیز جو حضرت گنگوہیؒ نے اپنے اس مکتوب میں لکھی ہے وہی دراصل طاعات سے لذت کا حصول ہے۔جیسا کہ امام نووی اور دوسرے محدثین فرماتے ہیں کہ حلاوتِ معنوی مراد ہے۔یعنی طاعات میں لذت محسوس ہونا اور اللہ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی کے لیے بڑی سے بڑی تکالیف کو بخوشی برداشت کرنا اور اللہ ورسول کی خوشنودی کو تمام دنیا کے مال ومتاع پر ترجیح دینا۔

بهجة النفوس شرح منتخب بخاری میں محدث کبیر عارف باللہ شیخ ابن ابی جمرہؒ فرماتے ہیں کہ سادات صوفیہ نے حلاوت حسی مراد لی ہے اور فرماتے ہیں کہ ساداتِ صوفیہ کی تحقیق ہی اس مسئلہ میں درست ہے۔کیوں کہ صوفیہ نے حدیث کے لفظ کو بغیر تامل کے اپنے ظاہر پر رکھا اور یہ بھی فرمایا کہ ہر بات ایسی ہے کہ اس کا ادراک وہی کر سکتے ہیں جو اس مقام تک پہنچے ہوں۔لہٰذا اگر تمہیں محسوس نہیں ہوتی تو جنھیں محسوس ہوتی ہے۔ان کی بات کو تسلیم کرو اور یہ دعویٰ مناسب نہیں کہ حدیث میں وہ مرتبہ یعنی حلاوت حسی مراد نہیں۔کیونکہ ''ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی''

اور شاعر نے بھی خوب کہا ہے:

اذلم ترا الهلال فسلم

لاناس رأوه بالابصار

جب چاند تمھیں نظر نہ آئے تو جن لوگوں نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ان کے کہنے سے مان لو۔پھر فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام مثلاً حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت خبیب اور سلف صالحین کے حالات شاہدِ عدل ہیں کہ وہ حلاوتِ حسی سے محظوظ ومشرف ہوئے۔(نصر الباری تیغر لیسیر)

شہادتِ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

افادات: مولانا سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ

مرتب: سید محمد کفیل بخاری

سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی انقلاب انگیز شہادت تاریخ اسلام کا ایک مسلّمہ اور مصدقہ واقعہ ہے۔ جس کے منفی اثرات سے اُمت قیامت تک کے لیے دو دھڑوں میں تقسیم ہوکر رہ گئی۔ ان میں عقائد اور دین کے متعلق اتنا زبردست اختلاف اور بُعد پیدا ہو چکا ہے۔ جس کا ختم ہونا تو اب عملاً غیر ممکن ہے' اور کم ہونا بھی مشکل ترین معاملہ ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی قطعی اور یقینی امر ہے کہ آپ کی شہادت کا دردناک حادثۂ فاجعہ امیر یزید کے عہد خلافت اور عبید اللہ ابن زیاد کی گورنری کے دور میں محرم ۶۱ ہجری کے اندر پیش آیا۔ لیکن یہ مسئلہ کہ حُکام کوفہ کے ساتھ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی آخری گفتگو کے مطابق آپ کے اِرادہ میں کوفہ کے عوام کے حیرت انگیز سیاسی انقلاب کے باعث دمشق جا کر براہِ راست امیر یزید کے ساتھ اپنا معاملہ طے کرنے کا جو تغیُّر پیدا ہوا تھا' اس کے بعد بھی آپ کی فطرت ونسبت کے خلاف اور متضاد مطالبہ منوانے کا بہانہ بنالیا گیا۔ نتیجتاً آپ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص نسبی اور روحانی تعلق کی بنا پر اپنی خداداد غیرت وحمیت اور عزیمت وشجاعت کا بے مثال مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اپنی ہی جان قربان کردی، بلکہ اپنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کو بھی شہید ہوتے ہوئے دیکھ کر خون کے گھونٹ پیئے اور اپنے دینی مؤقف پر کوہِ استقلال بن کر آخری سانس تک ثابت قدم رہے۔ جب آپ کے آفت ومصیبت اور درد وغم چشیدہ بقیہ اہلِ خانہ دمشق پہنچائے گئے تو حادثۂ کربلا کی تفصیلی روداد سن کر اور اس کے نتیجہ میں اس عظیم خاندان کے تباہ شدہ افراد کی حالت زار دیکھ کر امیر یزید نے قتلِ حسین کے حکم اور اس پر رضامندی سے علانیہ برأت ظاہر کی تو اسی دور میں آپ کی شہادت کے حقیقی اور خفیہ اسباب ومحرکات کے متعلق ایک عجیب ذہنی مخمصہ پیدا ہوا اور کچھ عرصہ بعد ایک مستقل اختلاف کی شکل اختیار کر گیا۔ حال آنکہ بہ ظاہر بالکل واضح اور یقینی طور پر معلوم ومسلّم ہے کہ آپ نے اپنے برادرِ بزرگ امام خامس وخلیفۂ راشد سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے امام سادس وخلیفۂ عادل وراشد سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کا معاہدہ قبول کر کے سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی تک صبر وتحمل کا ثبوت دیا اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی زندگی میں امیر یزید کی جانشینی کی جو بیعت لے چکے تھے اُسے بھی برداشت کرتے رہے۔ لیکن سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد آپ کے تمام دینی اور سیاسی عزائم مکمل طور پر ظاہر ہوگئے اور آپ نے اپنی عقل وفراست کے مطابق کوفہ وغیرہ کے حالات کا جائزہ لے کر وہاں پر موجود اپنے حامیوں کی دعوت قبول کر لی اور یزید کے خلاف انقلابِ حکومت وخلافت کے لیے بغیر کسی ظاہری ساز وسامان کے محض اہل کوفہ کی یقین دہانیوں پر اعتبار کر کے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ اور وہاں سے کوفہ کے لیے مع اہل وعیال واعزّہ واقارب رختِ سفر باندھ لیا۔ لیکن صد افسوس کہ حالات ان کے اندازہ وخیالات اور عزائم ومقاصد کے بالکل برعکس پلٹا کھا گئے اور آپ نہایت بے کسی وبے چارگی کی حالت میں انتہائی بے جگری سے دشمنوں کا مقابلہ کرتے

ہوئے جان کی بازی لگا کر جنت کو سدھار گئے۔فَاِ نَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اس حادثہ کے پس منظر اور حقیقی اسباب ومحرّ کات کے متعلق شروع سے جو دو ذہنی پیدا ہوگئی تھی۔اس نے بعد میں صدیوں تک بڑی شدت سے تاریخ پر اثر ڈالا' جو روایات کے اختلاف کے باعث اب تک سیرت وتاریخ کے ہر طالب علم کے لیے زبردست فکری خلجان اور ایسے حادثہ کے تجزیہ کے وقت سخت پریشانی کا موجب بنا رہتا ہے۔چنانچہ عالم اسلام کی معروف ترین اور جلیل القدر شخصیت، حجۃ الاسلام امام ''محمد غزالی'' رحمۃ اللہ علیہ سے امیر یزید کے اسلام واعمال اور قتلِ حسین رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں یزید کی ذمہ داری اور اس کے لیے دعاءِ مغفرت وغیرہ جیسے اہم اور خطرناک ترین مسئلہ کے متعلق ان کے ہم زمانہ ایک شافعی فقیہ ''عماد الدین ابو الحسن الکیاھراسی'' متوفی ۵۰۳ہجری نے استفہام کیا تو امام موصوف نے شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں مشہور عوامی تصور کی تردید کرتے ہوئے حسبِ ذیل حیرت انگیز جواب دیا جو مشہور مؤرخ علاّمہ ''ابن خلکان'' نے اپنی معروف کتاب ''وفَیاتُ الاَعیان'' میں نقل کیا ہے۔امام غزالیؒ امیر یزید کے اسلام کی تائید وتصدیق کے بعد قتلِ حسین رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

وَمَن زَعَمَ أَنَّ یَزِیْدَاَمَرَبِقَتْلِ الحُسَینِ أَورَضِیَ بِہٖ......فَیَنبَغِی أَن یُّعْلَمَ بِہٖ غایَۃَالْحَمَاقَۃِ،فَاِ نَّ مَنْ قُتِلَ مِنَ الْأَکَابِرِوَالْوُزَرَآءِ والسَّلَاطِینِ فی عَصرِہٖ لَواَرَادَأَن یَّعْلَمَ حَقِیقَۃَ مِنَ الّذی اَمَرَبِقَتلِہٖ......وَمَن الّذی رَضِیَ بِہٖ......وَمَنِ الّذی کَرِھَہٗ'لَمْ یَقدِرْ عَلیٰ ذٰلِکَ......وَأِنْ کَانَ الّذی قَدْقُتِلَ فِی جَوَارِہٖ وَزَمَانِہٖ وَھُوَیُشَاھِدُ،فَکَیْفَ لَو کَانَ فِی بَلَدٍ بَعِیْدٍ......وَزَمَنٍ قَدِیمٍ قَدِانْقَضیٰ......فَکَیْفَ یُعلَمُ ذٰلِکَ فِیمَاانْقَضیٰ عَلَیہِ قَرِیْبٌ مِنْ أَرْبَعِمِائَۃِ سَنَۃٍ فِی مَکَانٍ بَعِیْدٍ......وَقَدْ تَطَرَّقَ التَّعَصُّبُ فِی الْوَاقِعَۃِ فَکَثُرَتْ فِیْھَا الْأَحَادِیْثُ مِنَ الجَوَانِبِ فَھٰذا لاَمُرُ لَا یُعْلَمُ حَقِیقَتُہٗ'اَصْلاً،وَاِذَا لَمْ یُعْرَفْ......وَجَبَ اِحْسَانُ الظَّنِّ بِکُلِّ مُسْلِمٍ(الی آخرہٖ)(وَفَیَا تُ الاعْیَان''لِاَبْنِ خلِکَان''-ج ۱،ص ۴۶۵،طبع مصر)

''جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ یزید نے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قتل کا حکم دیا تھا یا وہ آپ کے قتل پر راضی تھا؟ تو جاننا چاہیے کہ ایسا شخص پرلے درجہ کا احمق ہے۔حقیقت یہ ہے کہ بہت سے اکابر اور وزراء اور سلاطین جو اپنے اپنے زمانہ میں قتل ہوئے۔اگر کوئی شخص اس بات کی حقیقت معلوم کرنا چاہے کہ اس کے قتل کا حکم کس نے دیا تھا اور کون اس پر راضی تھا؟اور کس نے اس فعل کو ناپسند کیا؟ تو وہ آدمی اس کی حقیقت معلوم کرنے پر ہرگز قادر نہیں ہو سکے گا اگرچہ یہ قتل اس کے پڑوس میں اور اس کے زمانہ میں اور اس کی موجودگی میں ہی کیوں نہ ہوا ہو۔تو پھر اس واقعہ کی اصل حقیقت تک کیسے رسائی ہوسکتی ہے جو دور کے شہر میں اور قدیم زمانہ میں ہوا ہو......؟ تو پھر اس واقعۂ کربلاء کی اصل حقیقت کا کیسے پتا چل سکتا ہے؟ جس پر (امام غزالیؒ کے زمانہ تک) چار سو برس کی طویل مدّت دور دراز مقام میں گزر چکی ہو......اور پھر یہ بھی مسلّم ہو کہ اس واقعہ کے بارہ میں (روافض کی طرف سے) تعصب کا راستہ اختیار کیا گیا ہو......جس کی وجہ سے مختلف فرقہ جات کی طرف سے اس کے متعلق بہ کثرت روایات بیان کی گئی ہوں۔اور جب حقیقت حال تعصب اور مخلوط ومتفرق روایات کے باعث معلوم نہیں ہوسکتی تو پھر ہر مسلمان کے متعلق جب تک قرائن موجود ہوں تو اس کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا واجب ہے۔'' (اداریہ ''الاحرار'' لاہور محرم ۱۴۱۸ھ مطابق اگست ۱۹۸۸ء شمارہ ۱۰/۹ جلد ۱۸)

یزید ابن معاویہؓ کے متعلق سیدنا حسینؓ کا تأثر:

ایک صاحب نے سوال کیا ہے کہ یزید سے متعلق کیا تأثر ہے؟ یزید کے متعلق میرا تو کوئی تأثر نہیں۔ البتہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ تأثر یہ ہے کہ وہ اسے مسلمان سمجھتے تھے اور فرماتے تھے: ''اگر وہ میری بات سن کر مان لے تو میں اس کی ''بیعت'' کرنے کو تیار ہوں۔'' لہٰذا میرا اپنا کوئی تأثر نہیں نہ میں نے یزید کو دیکھا' نہ اس کے پیچھے نماز پڑھی۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بڑے بھائی سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سمیت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کے بعد دمشق جا کر اس کے ساتھ نمازیں بھی پڑھیں اور اکٹھے کھانا بھی کھایا۔ یزید ان کے ہاتھ بھی دھلاتا تھا۔ سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سامنے بیٹھے ہوتے تھے۔ پھر ۵۲ھ کے ذوالقعدہ میں قسطنطنیہ کے میدان میں قائد لشکر ہونے کی وجہ سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے یزید کے پیچھے نمازیں بھی پڑھیں۔ اس غزوہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ عبداللہ ابن عمر بھی تھے اور عبداللہ ابن زبیر بھی تھے، عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے اور بہت سے جلیل القدر صحابہ بھی تھے۔ ان سب نے ۵۲ھ کے معرکۂ قسطنطنیہ میں فوجی کمانڈر یزید کے پیچھے نمازیں پڑھیں اور جب اسی میدان میں میزبانِ رسول ﷺ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو شرعی ضابطہ اور مسنون عمل کے مطابق امیر جیش یزید نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھایا۔ تمام صحابہ سمیت سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے بھی یزید کی قیادت میں شرکتِ جہاد کی طرح اس کی امامت میں نماز جنازہ بھی ادا کی تھی۔ بہرکیف وہ کلمہ گو تھا، مسلمان تھا۔ کریکٹر ہم نے نہیں دیکھا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے اس کو یہ نہیں کہا جو لوگ کہتے ہیں' یا کچھ مولوی اور ذاکر کہتے ہیں۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم میں اپنے اپنے باپ کی وجہ سے اختلاف ہے۔ وہ دونوں لڑے تھے' اب ہم دونوں کی لڑائی ختم ہو سکتی ہے۔ وہ میری شرائط مان لے' مجھ سے وہ گفتگو کر لے تو اَضَعُ یَدِی فِی یَدِہٖ میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ دینے ''بیعت'' کرنے کو بھی تیار ہوں!'' اس وقت کوفہ کا گورنر عبیداللہ ابن زیاد تھا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی محترمہ ام البنین رحمتہ اللہ علیہا کے بھائی اور کربلا میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے علم بردار، اور وفادار وفداء کار ماں سے سوتیلے بھائی جناب عباس کے حقیقی ماموں حضرت ذوالجوشن ضبائی صحابی رضی اللہ عنہ کا بیٹا شمر جو بدبختی سے سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا مخالف و دشمن اور ابن زیاد کا مشیر و معاون خصوصی بنا ہوا تھا اور بعد میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے قاتلوں میں شامل ہو کر جہنم کا خریدار بن گیا تھا۔ اس شمر کے بھڑکانے سے ابن زیاد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی تین بہترین شرائط ماننے سے منکر ہوا۔ نفسانیت و شیطنت کی تکمیل اور اپنے حسد و بغض کی تسکین کے لیے یزید کے حقیقی منشاء اور حکم کے خلاف سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے اپنے ہاتھ پر غیر مشروط بیعت کے مطالبہ پر اڑ گیا۔ اس نے کہا کہ میں یزید کا نمائندہ ہوں۔ اس لیے بجائے دمشق جا کر یزید سے خود معاملہ طے کرنے کے یہیں میرے ہاتھ پر بیعت کرو۔ تو اس پر جواباً سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وَاللّٰہِ لَنْ یَّکُوْنَ ھٰذَا - اِلَّا بَعْدَ الْمَوْت ''یہ نہیں ہو سکتا' تیری یہ حیثیت نہیں ہے کہ ''لونڈی بچے اور ذلیل لوگ'' مجھ سے غلط مطالبہ کر کے غیر مشروط بیعت لیں یہ بات میرے جیتے جی اور چپ چاپ ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ہاں! میرے مرنے اور قتل ہو جانے کے بعد تم میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ میں لے کر سمجھ لو کہ میں نے بیعت کر لی ہے؟ تو یہ ہو سکتا ہے۔ تم اس سے میری گفتگو کراؤ' وہ میری بات اور شرائط مان لے۔ ورنہ یزید کی خاطر تمہارے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔'' اس واقعہ کا حاصل تو سارا اتنا ہی ہے باقی سب لفاظی

سبائیوں رافضیوں کی عجمی ڈرامائی داستان ہے اور کچھ نہیں!

(اقتباس خطاب: جام پور ۲۴ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ ۲۹ رمئی ۱۹۸۱ء مطبوعہ: ''الاحرار'' ش ۱، ۲ ج ۱۰، رمضان ۱۴۱۰ھ۔ اپریل ۱۹۹۰ء)

آخر میں شہیدِ غیرت، مظلوم کربلا سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کا ارشادِ گرامی اور مشہور تین شرائط مطالعہ فرمائیں جو آپ نے ابن زیاد کے سامنے پیش فرمائیں۔ امام تاریخ وسیرت سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ نے مصدقہ تاریخی حوالوں سے مرتب کر کے انہیں مسلسل شائع کیا۔ سیدنا حسین ﷺ کا یہ ارشادِ گرامی واقعہ کربلا کے اسباب اور سازش کو سمجھنے اور تاریخ کی مکذوبہ روایات کی دبیز تہوں سے اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے قولِ فیصل اور برہانِ قاطع ہے۔

ارشادِ گرامی سیدنا حسین رضی اللہ عنہ:

ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے

☆ ابن زیاد کے ہاتھ پر یزید کی بیعت؟ تو خدا کی قسم! یہ بات میری موت کے بعد ہی ممکن ہے۔ ہاں! اگر باعزت طریقہ سے معاملہ فہمی مقصود ہے تو پھر مدینہ کو واپسی یا سرحد پر چلے جانے کے علاوہ تیسری صورت یہ ہے۔

☆ مجھے یزید کے پاس جانے دو تاکہ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں۔ پھر وہ میرے متعلق جو مناسب سمجھے گا خود فیصلہ کرے گا۔ (البدایہ لابن کثیر ج ۸، ص ۷۰)

.....اور یا میں اپنا ہاتھ یزید بن معاویہؓ کے ہاتھ میں دے دوں تو وہ میرے اور اپنے بارے میں جو مناسب ہو رائے قائم کرے گا۔ (تاریخ الامم والملوک۔ للطبری ج ۶، ص ۲۳۵)

☆ سیدنا حسین ﷺ سے پختہ روایت ہے۔ آپ نے کمانڈر کوفہ عمر بن سعدؓ سے فرمایا: میری تین باتوں میں سے ایک پسند کر لو:

(۱) یا میں اس جگہ لوٹ جاتا ہوں جہاں سے آیا ہوں

(۲) یا یہ کہ میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ پر رکھ دوں جبکہ وہ میرے چچا کا بیٹا ہے تو وہ میرے متعلق اپنی رائے خود قائم کرے گا۔

(۳) یا پھر مجھے مسلمانوں کی سرحدات میں سے کسی سرحد کی طرف روانہ کر دو تو میں وہیں کا باشندہ بن جاؤں گا۔ پھر جو نفع اور آرام وہاں کے لوگوں کو حاصل ہوگا، وہی مجھے بھی مل جائے گا اور جو نقصان اور تکلیف وہاں کے لوگوں کو ہوگی وہی مجھے پہنچے گی۔

(بحوالہ: الشافی مع التلخیص ص ۲۷۱ طبع ایران۔ تصنیف السید ابی القاسم علی بن الحسین بن موسیٰ بن محمد بن موسیٰ بن ابراہیم بن موسیٰ بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن زین العابدین علی الاوسط بن السبط سیدنا الحسین بن سیدنا علی بن ابی طالب علیہم الرضوان)

☆ اے کاش! یہ شرائط نامہ طے ہو جاتا تو امت کو مظلومی حسین ﷺ کا روزِ غم دیکھنا نصیب نہ ہوتا اور نہ ہی..... یزید کے لیے سبّ وشتم اور لعن وطعن کا دروازہ کھلتا۔ بہرحال جناب سیدنا حسین ﷺ کا قول وعمل ہمارے لیے ایک دائمی درسِ عبرت وغیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شہیدِ کربلا ﷺ کی سچی پیروی نصیب فرمائیں۔ آمین!

☆☆☆

اسلام کا تصورِ ریاست

مولانا عبدالحق چوہان رحمۃ اللہ علیہ
مرتب: ابومعاویہ رحمانی چوہان

خداوند قدوس نے بنی نوع انسان کو ایک ایسی ممتاز اور منفرد خصوصی فطرت سے نوازا ہے کہ وہ اس حیاتِ مستعار کے ہر لمحہ میں تعاون باہمی اور اشتراک عمل کا محتاج ہے۔ انسان کی اس تمدنی زندگی میں ہر فرد اور جماعت کے لیے ایک دوسرے پر باہمی اشتراک کے باعث کچھ خصوصی حقوق ذمہ ہوتے ہیں، جن کے تحفظ اور صیانت کے لیے انسان فطری طور پر ایک ایسے ضابطۂ حیات اور قانونِ اجتماعی کا محتاج ہے جس کی آئینی دفعات انسان کے انفرادی اور اجتماعی حقوق کی متکفل ہوں اور باہمی تعدی اور تجاوز کا انسداد کرے۔

من عناية اللّٰه سبحانه بالانسان ان خلق الانسان مدنى الطبع لايتم ارتفاقه الابصحبته بنى نوعه واجتماعهم وتعاونهم (البدور البازغہ۔ص ۸۴)

ترجمہ: خداوند قدوس کی عنایات میں سے انسان پر ایک عنایت یہ ہے کہ انسان کو اس طرح کا مدنی الطبع پیدا کیا ہے کہ اس کی زندگی کے منافع اپنے ہم نوع افراد کی صحبت ان کے اجتماع اور باہمی تعاون کے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتے۔

انسان اپنی اس اجتماعی زندگی کے تحفظ اور باہمی تعاون کو مستحکم کرنے کے لیے فطری طور پر نظامِ حکومت کا محتاج ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت ہی ایک ایسا نظام ہے جو کہ انسان کی تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی تمام ضروریات ہی کا متکفل ہے اور یہی وہ نظام ہے جو کہ انسان کی اس فطری ضرورت کے تمام مقتضیات کو محیط ہے۔ نظام اسلامی اپنے خصوصی اور ممتاز اوصاف کے اعتبار سے انسان کے تمام اختراع کردہ نظام ہائے حیات سے منفرد ہے۔ اسلامی نظام کو جن خصوصی اوصاف کے باعث برتری حاصل ہے۔ ان میں اسلامی ریاست کے قیام کی غرض وغایت۔ اسلامی ریاست کے تصور اقتدار مجلس شوریٰ، کفالت عامہ اور قانونی مساوات کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انسان کی اس فطری ضرورت کے پیش نظر خداوند قدوس نے اسلامی نظامِ حکومت کے احکام نازل فرمائے۔ اختصاراً اسلامی نظام حکومت کے خصوصی اوصاف ذکر کیے جاتے ہیں۔

اسلامی نظامِ حکومت کی غرض وغایت:

اسلامی ریاست کا مرکزی تصور اور اس کے قیام کا محور حصولِ تنعم وتعیش نہیں بلکہ اشاعت دین، اعلاء کلمۃ اللہ اور نظامِ عدل کا قیام ہے۔ اس لیے علماء سیاست نے اسلامی ریاست کی تعریف ان الفاظ سے بیان کی ہے۔

الخلافة هی الریاسة العامة فی التصدری اقامة الدین باحیاء العلوم الدینیة و اقامة ارکان الاسلام والقیام بالجهاد وما یتعلق به من ترتیب الجیوش و الفرض للمقاتلة و اعطا ئهم من الفئ و القیام بالقضاء و اقامة الحدود و رفع المظالم و الامربالمعروف و النهی عن المنکر نیابةً عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم . (ازالۃ الخفاء، ص۲، ج۱)

ترجمہ: خلافت ایک ایسی ریاست عامہ ہے جس سے مقصود احیاء علوم دینیہ کے ساتھ اقامت دین ہے اور ارکان اسلام کا قائم کرنا اور جہاد کا قیام اور جہاد کے متعلق جو امور ہوں جیسے لشکروں کی ترتیب، مجاہدوں کی تنخواہوں کا تقرر اور مال فئ میں سے ان کو حصہ دینا قاضیوں کا تعین اور اقامت حدود اور مظالم کا انسداد نیکی کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا۔ خلیفۂ وقت امور خلافت کو اس اعتبار سے سرانجام دے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نائب ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت اپنے جن اوصاف اور خصوصیات کے باعث دوسرے نظاموں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ اگر چہ وہ متعدد اور بے شمار ہیں لیکن ان میں سے سب سے جو اہم امر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست ایک نیابتی اور خلافتی حکومت ہے۔ جس میں اقتدار و اختیار اعلیٰ کا سرچشمہ تمام تر خداوند قدوس کی ذات والاصفات ہے۔ اسلامی ریاست کا قانون اللہ کا قانون ہے۔ اس میں حکومت اللہ کی حکومت ہے۔

اسلامی نظامِ عدل کے اہم فریضہ کی سرانجام دہی کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی حاکم ہے اور خود ہی محکوم ہے۔ کیوں کہ اسلامی سلطنت نہ تو خلیفۂ وقت کی ملکیت ہے اور نہ ہی اس کے خاندان کی بلکہ ملکیت تو صرف اللہ کی ہے لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق ہے اور ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے حیطۂ اختیار میں تحفظ حقوق ریاست اور نظامِ عدل کے قیام کی جدوجہد اور سعی مسلسل میں مصروف رہے اور خلیفۂ وقت کی تمام تر مساعی کا مرکزی محور صرف اور صرف اقامت دین اور نظامِ عدل کا قیام ہے۔ اسلام کے اس اساسی دستور کی طرف خلیفۂ اوّل سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبہ میں ان الفاظ کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے:

ایها الناس قدولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقومونی الصدق امانة والکذب خیانة والضعیف فیکم قوی عندی حتی اخذله حقه والقوی ضعیف عندی اخذ منه الحق اطیعونی فی ما اطعت اللّٰه ورسوله فأذا عصیت اللّٰه ورسوله فلاطاعة لی.

ترجمہ: اے لوگو! میں تمہارا ولی مقرر کیا گیا ہوں۔ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر میں برائی کروں تو مجھے سیدھا کرو۔ سچائی امانت ہے۔ جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں سے جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کا حق دلوادوں اور قوی ضعیف ہے۔ یہاں تک کہ اس سے غریب کا حق لے لوں۔ میری اطاعت کروں اس وقت تک جب تک میں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرتا رہوں۔ اگر میں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کے مناصب وعہدہ جات طلب زر اور حصول تعیش وتنعم کے لیے نہیں ہوتے بلکہ محض اشاعت دین کے لیے بطور امانت کے باصلاحیت اور متدین اور احساس ذمہ داری کے جذبہ رکھنے والے افراد امت کو تفویض کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنے خطبہ میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اللھم انی اشھدک علیٰ امراء الامصار فانی بعثتھم لیعلمون الناس دینھم وسنة نبیھم ویقسمون فیئھم ویعدلون (ازالۃ الخفاء، ج ۲، ص ۶۴)

ترجمہ: اے اللہ! میں شہروں کے عمّال پر تجھے گواہ بناتا ہوں۔ میں ان کو صرف اس لیے مقرر کر کے بھیجتا ہوں۔ تاکہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت سکھلائیں اور ان کے اندر مال فئی تقسیم اور ان کے درمیان نظام عدل قائم کریں۔ اور ایک دوسرے خطبہ میں خود عمّال ہی کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

الا وانی لم ابعثکم امراء ولا جبّارین ولکن بعثتکم آئمة الھُدیٰ یُھتدی بکم فادّروا علی المسلمین حقوقھم ولاتضربوھم فتذلوھم ولا تحمدوھم فتفتنوھم ولاتغلقوا الابواب دونھم فیأکل قویھم ضعیفھم ولا تستأثروا علیھم فتظلموھم.

ترجمہ: خوب سمجھ لو کہ میں نے تم کو حکمران اور سخت گیر بنا کر نہیں بھیجا بلکہ تمہیں بطور ائمہ ہدایۃ کے طور پر مقرر کیا ہے۔ تاکہ لوگ تمہارے ذریعے ہدایت حاصل کریں۔ پس مسلمانوں کے حقوق ادا کرو۔ ان کو زدوکوب نہ کرو کہ وہ ذلیل ہو جائیں۔ ان کی تعریفیں نہ کرو کہ وہ (غلط فہمی میں پڑ کر تکبر کے) فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ ان کے سامنے اپنے دروازے بند نہ کرو کہ طاقت ور کمزور کو کھا جائیں۔ ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو کہ اس طرح ان پر ظلم نہ کرنے لگو۔

شوریٰ:

قرآن مجید میں مسلمانوں کے خصوصی اوصاف میں سے ایک وصف یہ بیان کی گئی ہے۔ وامرہم شوریٰ بینھم اور ان کا نظام باہمی مشورہ پر مبنی ہوگا۔ اسلامی ریاست میں مجلس شوریٰ کو ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کے اندر مجلس شوریٰ کے دائرہ کار کو بھی متعین کیا گیا ہے۔ مجلس شوریٰ میں وہ نئے پیدا ہونے والے حوادث وواقعات زیر بحث آئیں گے۔ جن کے متعلق قرآن مجید وحدیث اور تعامل صحابہ کرام میں کوئی واضح اور غیر مبہم حکم موجود نہ ہو۔ اصحابِ شوریٰ ایسے حوادث کے متعلق قرآن وحدیث اور تعامل صحابہ کی روشنی میں شرعی اجتہاد کے ذریعے احکام کا تتبع وتفحص کریں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مجلس شوریٰ کے ارکان قرآن وحدیث کے عالم اصابت رائے تدین اور فقیہانہ بصیرت کے حامل ہوں۔ اصحابِ شوریٰ کے اوصاف کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اشارہ واضح ہے۔

(۱) **ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم سئل عن الامر یحدث لیس فی کتاب وسنة فقال ینظر فیہ العابدون من المؤ منین** (سنن دارمی، ص ۲۸)

ترجمہ: تحقیق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا ذکر نہ تو کہیں

قرآن میں ہو اور نہ سنت میں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ پر مسلمانوں کے صالح لوگ غور کر کے اس کا فیصلہ کریں گے۔

ایک دوسری حدیث میں یہ مضمون سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس طرح منقول ہے:

(۲)عن علی قال قلت یارسول اللہ ان اعرض لی امرلم ینزل قضاء فی امرہ ولاسنة تأمرنی؟قال تجعلونہ شوری بین اھل الفقہ والعابدین من المؤمنین ولانقض فیہ برأیک خاصة (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

ترجمہ: سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر میرے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے' جس کا ذکر قرآن مجید میں نازل نہ ہوا ہو اور نہ ہی اس کا ذکر سنت میں ہو تو اس معاملہ میں آپ مجھے کیا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس کو قانون اسلامی میں بصیرت رکھنے والوں اور عبادت گزار صالحین کے مشورہ سے طے کرو اور اس میں تنہا اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔

کتب سیرت وحدیث میں خلیفۂ اوّل سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ امور کہ جن کے متعلق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو تو آپ جلیل القدر صحابہ کے مشورہ سے ان امور کا فیصلہ کرتے تھے۔ چنانچہ میمون بن مہران سے روایت ہے کہ:

حدثنا میمون بن مھران فقال کان ابوبکر اذاورد علیہ الخصم نظر فی کتاب اللہ تعالیٰ فأذا وجد فیہ مایقضی بینھم قضی بہ وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذالک الامر سنةً قضی بہ فان اعیاہ' خرج فسئل المسلمین وقال اتانی وکذا فھل علمتم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قضی فی ذالک بقضاء فربما اجتمع الیہ النفر کلھم یذکر من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمع رؤس الناس وخیارھم فاستشارھم فأذا اجتمع رأیھم علیٰ امر قضی بہ (سنن دارمی)

ترجمہ: ہم سے میمون بن مہران نے روایت بیان کی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جس وقت کوئی فریق معاملہ یا مقدمہ لاتے تو آپ پہلے اس پر کتاب اللہ کی روشنی میں غور کرتے۔ اگر اس میں ان کو کوئی ایسی چیز مل جاتی جس سے ان کے معاملہ کا فیصلہ ہوسکتا تو اس کے مطابق وہ فیصلہ کر دیتے اور اگر کتاب اللہ میں ان کو اس فیصلہ کے لیے کوئی چیز نہ ملتی اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی کوئی چیز نہ پاتے اور تلاش کر کے تھک جاتے تو پھر نکل کر مسلمانوں سے دریافت کرتے کہ میرے سامنے اس طرح کا معاملہ آیا ہے کیا کسی شخص کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ ہے جو اس قسم کے معاملہ سے متعلق ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کے پاس متعدد ایسے اشخاص جمع ہو جاتے جو اس قسم کے معاملہ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ بیان کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ امت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت نہ ملتی تو پھر قوم کے سربرآوردہ اور پسندیدہ افراد کو جمع کر کے ان سے

مشورہ کرتے اور پھر وہ کسی بات پر اتفاق کر لیتے تو اس کے مطابق وہ اس معاملہ کا فیصلہ کر دیتے۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق کتب سیرت میں ہے کہ:

كان من سيرة عمر رضى الله عنه انه كان يشاور الصحابه ويناظر هم حتى تنكشف الغمة وتأتيه الثلج فصار غالب قضاياه وفتاواه متبعة فى مشارق الارض ومغاربها. (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۳۲)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریق کار یہ تھا کہ وہ معاملات میں صحابہ سے مشورہ کرتے اور ان سے بحث کرتے۔ یہاں تک کہ الجھن دور ہو جاتی اور دل پوری طرح مطمئن ہو جاتا۔ یہ اس کا اثر ہے کہ ان کے فتوے اور فیصلے تمام مشرق اور مغرب میں معمول بہ بنے۔

کتب تاریخ وسیرت میں متعین طور پر اصحاب شوریٰ میں جن حضرات کے اسماء گرامی مذکور ہیں۔ وہ یہ ہیں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔

کفالت عامہ:

اسلامی ریاست کی مدار چونکہ اس امر واقعی پر ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ خداوند قدوس کی ذات والا صفات ہے۔ اس لیے انسان دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ نیابت اور خلافت کا منصب جلیل اوّلاً اور بالاصالہ انبیاء علیہم السلام کے لیے ثابت ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کے لیے آپ کے توسط سے حاصل ہے۔

قاضی بیضاوی آیت **انی جاعل فی الارض خلیفة** کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

والمراد به آدم عليه السلام لانه كان خليفة الله تعالىٰ فى ارضه وكذالك كل نبى استخلفهم فى عمارة الارض وسياست الناس وتكميل نفوسهم وتنفيذ امرفيهم.

ترجمہ: اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ کیوں کہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا۔ زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں۔

اس لیے اسلامی ریاست میں خلیفۂ وقت کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں رب العالمین کی ربوبیت کا مظہر بن کر ایک ایسا صالح نظام قائم کرے جو ایک طرف روحانی اور اخلاقی برتری کا ضامن ہو تو دوسری طرف سیاسی تمدنی اور معاشی ترقی وکمال کا بھی متکفل وحامل ہو۔ انہی وجوہ کی بناء پر اسلامی ریاست جہاں عوام کے اخلاق کو درست کرنے کا انتظام کرتی ہے۔ وہاں اس بات کا بھی انتظام کرتی ہے۔ اسلامی ریاست کے اندر رہنے والا کوئی فرد بھی زندگی کی بنیادی ضرورت سے محروم نہ ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

السلطان ولی من لاولی له . حکومت ہر اس شخص کی دست گیر و مددگار ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔

ایک دوسرا فرمان ہے: **انا وارث من لاوارث له اعقل له** ۔ میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں۔ اس کی جانب سے دیت ادا کروں گا۔ (اگر اس کے ذمہ واجب الادا ہوگی)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں اس کفالت عامہ کا بہت ہی اچھا انتظام فرمایا اور برسر اعلان فرمایا کہ

انی قد فرضت بکل نفس مسلمة فی شهر مُدَّیْ حِنطة وقطیٰ خل .

میں نے ہر مسلمان فرد کے لیے فی ماہ دو مُد گندم اور دو قسط سرکہ کے مقرر کیے ہیں۔

اگر بیت المال میں اتنی گنجائش نہ ہو تو پھر یہ شہر کے اغنیاء پر لازم ہے کہ اس شہر کے فقراء کی کفالت کریں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔

ان اللّٰه تعالیٰ فرض علی الاغنیاء فی اموالهم بقدر مایکفی فقراء هم فان جاعوا اوعروا وجهد وافیمنع الاغنیاء حق علی الله تعالیٰ ان یحاسبهم یوم القیمة ویعذبهم علیه . (المحلی، ص ۱۵۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے احوال پر ان کے غریب بھائیوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں محض اس بناء پر کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن اس کی باز پرس کرے گا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔

مساوات:

اسلامی ریاست میں نظامِ عدل اور قانون کی بالادستی کے لحاظ سے ہر شخص برابر ہے۔ حکومتِ الٰہیہ میں شرافت اور بزرگی کا معیار کسی خاص قبیلہ اور گروہ سے مختص نہیں بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری شرافت کا معیار ہے۔ قرآن حکیم نے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ کہہ کر صرف انسانی اعمال کو شرف واحترام کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

یا معشر قریش ان الله قداذهب منکم نخوة جاهلیة وتعظمها بالآ باء الناس من آدم و آدم من تراب

(ابن ہشام، ص ۴۱۲، ج ۲)

ترجمہ: اے گروہ قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر خدا نے مٹا دیا ہے۔ تمام انسان آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہوئے ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے اعلان فرمایا کہ:

لیس للعربی فضل علی اللعجمی والاللعجمی فضل علی العربی کلکم ابناء آدم و آدم من تراب.

ترجمہ: عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم سب کے سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

ایک دفعہ قریش کے ایک معزز خاندان بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی اور چوری کی سزا اسلام میں قطع ید

ہے۔بعض لوگوں نے اس عورت کی خاندانی عظمت کے پیش نظر اس کے لیے قانون میں کچھ رعایت حاصل کرنا چاہی۔ چنانچہ حضرت اسامہ بن زیدؓ سے (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کونہایت کومحبوب تھے) درخواست کی گئی کہ وہ اس عورت کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کریں۔انھوں نے لوگوں کے اصرار پر مجبور ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی۔آپ نے ان کی اس سفارش پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا پھر لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے پہلے بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی ارتکاب جرم کرتا تو اسے سزا دیتے مگر جب کوئی بااثر آدمی یہ حرکت کرتا تو اس سے درگزر کرتے۔اس کے بعد نہایت ہی زور کے ساتھ آپ نے فرمایا کہ:

والذی نفس محمد بیدہ لوسرقت فاطمة بنت محمد لقطعت یدھا.

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے۔اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹ دیتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک سپہ سالار کوضروری ہدایت دیتے ہوئے اس اصول مساوات کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی:

لیس بین اللّٰہ وبین احد بنسب الابطاعة فالناس شریفھم وضیعھم فی دین اللہ سواء .

ترجمہ: اللہ تعالیٰ اور کسی شخص کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے مگر اس کی اطاعت اس وجہ سے خدا کے قانون میں شریف اور حقیر سب کے سب برابر ہیں۔

اسلامی ریاست کی یہی وہ خصوصیات ہیں کہ جن کے باعث حکومت الٰہیہ کو ظل اللہ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ:

السلطان ظل اللہ فی الارض یأوی الیہ کل مظلوم من عباداللہ

ترجمہ: صالح حکومت زمین میں اللہ کے امن کا سایہ ہے۔جس کے دامن میں بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے۔

علماءِ حق کا ترجمان
المیزان
ناشران وتاجرانِ کتب
دینی، تاریخی، سیاسی، ادبی اور اصلاحی کتابوں کا معیاری ادارہ
دینی مدارس کے طلباء کے لیے وفاق المدارس کا تمام نصاب سب سے زیادہ رعایتی قیمت پر

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 042-7122981-7212762

نعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا دوست محمد ساقی رحمہ اللہ (چنیوٹ)
(فاضل دارالعلوم دیوبند)

کمالِ صبر دینِ عشق میں ضبطِ فغاں تک ہے
کہ درد و سوزِ عشقِ خستگاں دل سے زباں تک ہے
محمد مصطفیٰ بعد از خدا بالا و برتر ہے
عروجِ مصطفیٰ فرشِ زمیں سے لامکاں تک ہے
جہاں تک کام کرتی ہے نگاہِ شوق اے ہمدم
مری حدِ مسافت ، گرم رفتاری وہاں تک ہے
دَرِ اغیار پر کیوں کر ترا دَر چھوڑ کر جاؤں
کہ میری دوڑ اے آقا ! ترے ہی آستاں تک ہے
رسائی دور تک ہے عارفِ اہلِ بصیرت کی
بساطِ ہر حریص و بوالہوس عشقِ بتاں تک ہے
وفورِ غم سے خوں آمیز آنسو تھم نہیں سکتے
کہ خونبارئ چشمانم میرے خونِ رواں تک ہے
بہلا غم سے کیوں گریاں نہ ہووے ہم نشیں اے دل
سکونِ چشم و دل اس کا بیانِ داستاں تک ہے
خداوندا! بعشقِ مصطفیٰ سوزاں رہوں پیہم
حیاتِ چند روزہ کی فضا قائم جہاں تک ہے
دِلا! اس عالمِ پیری میں سوگندِ خدا مجھ کو
کہ سوزِ عشقِ احمد میرے مغزِ استخواں تک ہے
درِ احمد پہ رحمت نے مجھے جھنجھوڑ کر روکا
کہ تیری حدِ راہِ عشق اے ساقی یہاں تک ہے

کس لیے؟

جعفر بلوچ (لاہور)

ابتذال آرائی و فحبہ شعاری کس لیے؟
علم و فن کے نام پر فضلہ نگاری کس لیے؟
نیکیوں کے ذکر پر ، حُسنِ عمل کی بات پر
عذر خواہی کس لیے اور شرمساری کس لیے؟
کس لیے مدحت گری تحریف اور تلبیس کی؟
محکماتِ شرع سے باطل براری کس لیے؟
حق پرستی کیوں ہدف ہو طنز اور تضحیک کا
بت فروشی کس لیے ؟ ناحق شعاری کس لیے؟
پاک دھرتی کے مکیں کیوں سیرتاً ناپاک ہوں؟
ہوں فلاح و خیر سے کردار عاری کس لیے؟
ملتِ اسلام کی دشمن ہے ملت کفر کی
کفر کی ملت سے اہلِ دیں کی یاری کس لیے
بھائیوں کو بھائیوں کا تو نے دشمن کر دیا
دیں سے اے ابنِ ابی ناسازگاری کس لیے؟
اشتہاری بِل ہیں اپنے اور لفافے ڈاک کے
قوم اتنی ہو گئی ہے اشتہاری کس لیے ؟
شائیلاکانہ معیشت اپنا ایماں ہو گئی
کس لیے ہم ہو گئے زر کے پجاری کس لیے؟
کیا ہمیں سے انتم الاعلون کا وعدہ نہ تھا؟
اب جہاں بھر میں ہے رسوائی ہماری کس لیے؟

لہولہو یہ قافلہ

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

کرب و بلا کا واقعہ
دردناک سانحہ
فاطمہؓ کے لال سے
ہے عشق مجھ کو برملا
اس عشق کا ہے ماجرا
اک ہمہمہ، اک طنطنہ
دشتِ جنوں کا سلسلہ

.....

لہولہو یہ قافلہ
سرِ خار تھا اک آبلہ
مہر و وفا کی داستاں
رقم ہوئی کہاں کہاں
علیؓ کا ایسا لال تھا
لبِ فرات جا بجا
اک فوجیوں کی باڑھ تھی
اور کوفیوں کا زور تھا
بس! مار دو کا شور تھا
خونِ رگِ حسینؓ تھا
زیبِ ریگِ کربلا
جو ڈٹ گیا امر ہوا

.....

کرب و بلا کا واقعہ
سدا یہ دیتا ہے صدا
حسینؓ دیکھ! سر ترا
سناں کی نوک پر رہا
کسی بھی شمر کے لیے
کبھی نہیں ہے جھک سکا
حسینؓ دیکھ پھر ترا
لہولہو یہ قافلہ
ہے میرے دیس میں چلا

☆☆☆

''میرا حج پھٹنے کو ہے.....''

ذوالکفل بخاری
اُملج (سعودی عرب)

سنا ہے اس سال مصر کے بڑے مفتی صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ مفت حج جائز نہیں ہے۔ سعادت حسن منٹو کہا کرتے تھے ''مال حرام بود و بجائے حلال رفت'' سرکاری مال کو مفت کا مال سمجھنے والے چھوٹے چھوٹے ''مفتی'' اور بڑے بڑے ''مفتے'' اگر سال میں ایک آدھ بار حج بھی کرلیں تو کیا قیامت آجائے گی؟ کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ کیوں کہ قیامت اپنے مقررہ وقت اور دن سے پہلے کبھی نہیں آسکتی۔ بطور مسلمان یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ فتوے والے مفتیوں کا بھی اور مفت والے مفتیوں کا بھی۔

اس سال کے حج کی سب سے اہم خبر یہ تھی کہ لوگ امن اور سلامتی والے ان مہینوں، دنوں اور مقامات سے بالکل امن وسلامتی سے گزرے اور وہ جو جان سے گزرے وہ بھی بحفظ وامان گزرے۔ آسودہ، آمادہ، تیار، لبیک کہتے ہوئے، راضی برضا، جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے، ''حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں'' پکارتے ہوئے۔ کسی نے در پر، کسی نے چوکھٹ پر اور کسی نے رہگزر میں آخری لبیک کہی۔ جس نے بھی دل نذر کیا اور جس نے بھی جاں واری، یہی کہتے ہوئے کہ:

تیرا آستاں جو نہ مل سکا، تیری رہگزر پہ جبیں سہی
ہمیں سجدہ کرنے سے کام ہے جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

یہی بات بھارت کی ایک جواں سال خاتون نے کہی۔ نو اور دس ذی الحجہ کی درمیانی رات میدان مزدلفہ کی سرد لمبی رات میں، کھلے آسمان تلے آباد، حدِ نگاہ تک پھیلتے ہوئے لاکھوں کلمہ گوؤں کے شہر یک شب میں ایک تنہا خاتون وہ بھی تھی جس کے خاوند نے پہلو میں درد کی شکایت کی تو فوراً طبی امداد کے مرکز کا مستعد عملہ اسے فوراً ہی اپنی عمارت میں لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹرز میں سے ایک، خستہ چال چلتا ہوا باہر آیا اور اس نے اٹک اٹک کر خاتون کو بتایا کہ مریض محبت نے علاج سے پہلے شفا پائی ہے۔ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آچکا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ تب حمد و مناجات، تسبیح و تہلیل اور گریہ وزاری سے آباد میدانِ مزدلفہ کی وسعتوں میں، اس نے چند بول ایسے بھی سنے جنھیں وہ زندگی بھر بھلا نہ پائے

گا۔نوجوان بیوہ نے کہا ''الحمدللہ مالک نے میرے شوہر کی آرزو پوری کردی۔وہ یہی تمنا لے کر یہاں آیا تھا:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو

لیکن اگر میں سوچتا ہوں کہ ہم آپ آخر کس دنیا میں بس رہے ہیں؟ ایسے میں مجھے اپنا دوست ''چودھری بٹ'' بہت یاد آتا ہے۔چودھری ذات کا جاٹ ہے لیکن بٹ برادری سے اس کے بعض ناگزیر اور ناگہانی تعلقات کی روشنی میں اسے چودھری بٹ کہنا ہی صائب ومناسب لگتا ہے (بلکہ فقہا کی زبان میں ''احواط واسلم وانسب'' لگتا ہے)۔چودھری ایک پڑھا لکھا آدمی ہے۔خوش ذوق، خوش حال اور خوش شکل۔ایک کامیاب کاروباری، انگریزی میں طاق، اردو میں رواں، فارسی میں بلبل، ایم اے انگریزی کرنے کے زمانے میں ہم اکٹھے تھے۔چودھری مجھ سے پوچھا کرتا کہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے ہر سال لاکھوں مسلمان اپنے اپنے ملک کے زرمبادلہ کا کروڑوں کا نقصان کرتے ہیں، اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ نماز کے بارے میں بھی چودھری کے خیالات اسی طرح کی روشن خیال ابتذال پسندی سے عبارت تھے لیکن وہ مصلحتاً (اور شاید مروتاً بھی) میرے سامنے ان کا اظہار نہیں کرتا تھا۔چودھری جسمانی فٹ نس اور روحانی بالیدگی ونشاط کے لیے یوگا ورزشوں کا ازحد معترف تھا اور ان پر نہایت اہتمام اور پابندی سے سال بسال سے عامل تھا۔ہر سال دو سال بعد کسی تفریحی سفر کو وہ اپنے لیے لازم جانتا تھا۔اس کے پسندیدہ تفریحی مقامات میں بنکاک اور بیروت وغیرہ سرفہرست تھے۔ بعض عرب اخبارات میں رپورٹ کیا گیا ہے کہ عین حج کے متبرک اور قبولِ ایام میں بعض خلیجی ریاستوں میں عیش ونشاط کے نام پر کیا کیا نامقبول اور نامعقول ہنگامہ ہائے طرب وبدمستی برپا کیے گئے۔مجھے نہیں معلوم کہ یہ رپورٹس پاکستانی اردو میڈیا تک پہنچیں یا نہیں۔ہمارے یہاں ایک خاص تعداد چونکہ ان پرجوش اور بیگانہ ہوش مسلمانوں کی بھی ہے جو عربوں کو منہ بھر کے گالی دینا ''کارِثواب'' سمجھتے ہیں۔اس لیے یہ بتانا اور جتلانا بھی ضروری ہے کہ عجمی اخلاق ودیانت کے جو مظاہرے یہاں خلیج میں عموماً اور ایام حج میں خصوصاً سعودیوں کے مشاہدے میں آتے ہیں، ان سے ہماری نیک نامی کو چھوڑیے، خود حج جیسے عمل کو، جس کے لیے لاکھوں روپوں کا خرچ اور ہزارہا میل کی مسافت گوارا کی جاتی ہے۔کیسے کیسے جھٹکے نہیں لگتے؟

جواں سال ڈاکٹر فاروق، ایک ہندوستانی سرجن ہیں اور سعودی وزارت صحت میں ملازم ہیں۔وجیہہ، خوش اطوار اور خوش گفتار، غازی آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔کلکتے میں پلے بڑھے اور علی گڑھ میں پڑھے۔حج سے چند دن پہلے کی بات ہے کہ ایک دن کچھ سراسیمہ اور گڑبڑائے ہوئے نظر آئے۔پوچھا خیریت ہے؟ فرمانے لگے حج کی تیاری ہے۔عرض کیا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ فرمایا نہیں وہ ہمارے فلاں کولیگ بھی فیملی سمیت حج کو جارہے ہیں۔آج

وہ لوگ ہمیں ملنے آ رہے تھے، ان کی پوری فیملی تھی۔ بس غضب ہوگیا۔ کیا ہوگیا ڈاکٹر صاحب؟ ارے صاحب ان ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ سے ہمارا سامنا ہوگیا۔ ان کی ''حج کی تیاری'' اتنی زبردست تھی کہ میرا حج تو بس پھٹنے ہی لگا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا اشارہ ان محترمہ کے لباس بے لباسی کی طرف تھا۔

مصر کے مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ مفت کا حج، سرکاری مال سے کیا گیا حج جائز نہیں، مقبول نہیں۔ مفتی صاحب! یہ بھی فرمایئے کہ مال حرام سے، رشوت سے، چوری ڈاکے سے، غبن سے، ظلم وزیادتی سے، ملاوٹ اور ناجائز منافع خوری سے کمائی گئی دولت سے حج کرنا کیسا ہے؟ ویسے تو ہمارے پاس ''مفتی'' محمد علی درانی اور ''مفتی'' شیخ رشید جیسے فقہائے کرام بھی موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں ہمارے لیے مصر کے مفتی صاحب کا قول ''مفتی بہ'' ہو ہی نہیں سکتا۔ درانی صاحب نے مخلوط میراتھن دوڑ کے جواز میں حج کی مثال پیش فرمائی تھی۔ فقہی استنباط کے لحاظ سے ''فتویٰ کوئی مجتہد'' ہی دے سکتا ہے۔ رہے شیخ رشید صاحب تو وہ ایک ''مقلد'' مفتی ہیں۔ فقہ پرویزیہ کے مقلد، البتہ گاہے گاہے وہ بعض پیچیدہ فتاویٰ کی صورت میں آنٹی شمیم جیسی ''مجتہد فی المذہب'' کے مذہب پر بھی فتویٰ دے دیتے ہیں۔

جس دن مجھے ڈاکٹر فاروق نے بتایا کہ اس کا حج ''پھٹنے'' سے بچ گیا ہے مجھے ڈاکٹر کی معصومیت پر بہت ترس آ گیا۔ ڈاکٹر شاعر مزاج آدمی ہے۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ جس کلکتے میں تم پلے بڑھے اسی کے ذکر سے مرزا غالب کے سینے میں تیر پیوست ہوتا تھا اور غالب نے کہا تھا'' کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب''۔ لیکن غالب کا زمانہ کب کا لد چکا۔ غالب تو غالب تھے، اقبال کا دور بھی گزر چکا جنھوں نے کہا تھا ''تیری نماز بھی حجاب، تیرا قیام بھی حجاب''۔ یہ اکیسویں صدی ہے، عرفات کے میدان میں ایک بزرگ مصری خاتون وضو خانے کی طرف گئیں وہ غلطی سے مردوں والے حصے کی طرف بڑھیں تو کئی حاجی صاحبان نے پکار کر کہا بی بی یہ ''رجال'' کے لیے ہے۔ رجال کے لیے ہے۔ خاتون یکبارگی ٹھٹھکیں اور پھر ایک جملہ کہہ کر پلٹ گئیں۔ ''رجال'' کیا تم میں اسامہ کے علاوہ بھی کوئی رجل ہے؟ آہ۔ بوڑھی اماں! ہم میں اسامہ سمیت کوئی بھی رجل نہیں ہے۔

الغازی مشینری سٹور
ہمہ قسم چائنہ ڈیزل انجن، سپیئر پارٹس
تھوک و پرچون ارزاں نرخوں پر ہم سے طلب کریں
بلاک نمبر 9 کالج روڈ، ڈیرہ غازی خان 064-2462501

سرمایہ دارانہ نظام میں شمولیت اور ووٹ کی شرعی حیثیت

مولانا محمد احمد حافظ

انتخابات سر پر ہیں اور آئندہ چند دنوں میں (اگر الیکشن ایک مرتبہ پھر ملتوی نہ ہوئے تو) پوری قوم ووٹنگ کے ذریعے جمہوری عمل سے گزرے گی۔ قوم ہر مرتبہ اس امید پر ووٹ کاسٹ کرتی ہے کہ شاید آنے والا دور ہمارے لیے کوئی مژدۂ جانفزا ساتھ لائے اور ان کے دکھوں کا مداوا ہو..... مگر واحسرتا!

سردست جو سوالات اہم ہیں وہ یہ ہیں کہ کیا جمہوریت ہی وہ واحد نظامِ حکومت ہے جو بنی نوع انسان کی فوز وفلاح کا ضامن ہے؟ کیا پچھلے ساٹھ سال کے تجربات ہمیں نئے انداز میں سوچنے اور بنتی بگڑتی حکومتوں کا تجزیہ ومحاسبہ کرنے کی دعوت نہیں دیتے؟ جمہوری نظام اور ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ پارلیمنٹ کس قسم کا ادارہ ہے اور اس کا ممبر بننا از روئے شریعت کیا حکم رکھتا ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جو اہل علم کے سامنے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سوالات کے جواب جاننے کے لیے جمہوری سسٹم کی ماہیت، اس کی عملیت اور مابعد الطبیعات کو جاننا ضروری ہے۔ اس لیے کہ سرمایہ داری، انسانی حقوق، جمہوریت، لبرل قوانین، جمہوری عدلیہ اور انتظامیہ میں گہرا اور مربوط تعلق ہے۔

معاشرہ ہو یا ریاست، اس کا وجود صرف فرد کے گرد گھومتا ہے۔ فرد کو نفی کر دیں تو معاشرہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اسی طرح محض ریاست کوئی حسّی چیز نہیں۔ انسانی دنیا کے تمام معاملات فرد کے گرد گھومتے ہیں۔ مثلاً صہیب ایک فرد ہے، اس کا تعلق عمر، طلحہ اور عبدالرزاق کے ساتھ ہے، وہ معاشرت ہے اور صہیب کا وہ تعلق جو حکمران کے ساتھ ہے، ریاست کہلاتی ہے۔ یہ نہیں کہ فرد نہ ہو اور معاشرہ بھی قائم ہو اور ریاست بھی.....! چنانچہ فرد اگر صالح ہے، شریعت کا پابند اور دینی اقدار کا احترام کرتا ہے تو معاشرہ مذہبی ہوگا اور ریاست بھی مذہبی ہوگی۔ فرد اگر کسی مذہب کا پابند نہیں ہے بلکہ فری یعنی ''آزاد'' ہے تو معاشرہ لبرل اور سیکولر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی انفرادیت اور سرمایہ دارانہ انفرادیت میں شرق وغرب کا فرق ہے۔

مذہبی انفرادیت میں بنیادی چیز عبدیت ہوتی ہے، عبدیت کا مطلب ہے کہ انسان ایک خارجی اور اَن دیکھے وجود کو اپنا الٰہ ومعبود مان لے، اُس کی خواہش، منشاء اور رضامندی کے لیے اپنی ساری خواہشوں کو فنا کر دے، اس کے کہے پر چلے اور منع کرنے پر رک جائے۔

سرمایہ دارانہ انفرادیت یہ ہے کہ انسان کسی کا عبد نہیں بلکہ وہ آزاد (Free) ہے۔ آزاد اِن معنوں میں کہ وہ

جو چاہنا چاہے چاہ سکے اور جس چیز کی خواہش اس کا نفس کرے اسے حاصل کر سکے۔ خواہشات بے پناہ ہیں اور انسان کو خواہشات کی تکمیل کے لیے بنیادی طور پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ ''سرمایہ'' ہے۔ سرمایہ ہی وہ بنیادی عنصر ہے جس کے ذریعے تمتع فی لارض اور تمتع فی الدنیا کے امکانات وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔ ایک بات جو یاد رکھنے کی ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت، مابعد الموت سے بحث نہیں کرتی بلکہ اس کے نزدیک موت ہی اختتامِ زندگی ہے۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ عقلیت میں زیادہ سے زیادہ سرمائے کا حصول اسی دنیا کو جنت بنانے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے ایک سرمایہ دار انسان کی ساری تگ ودو اور کدوکاوش کا محور محض سرمائے کا حصول ہوتا ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت میں جس طرح مابعد الموت کی بحث نہیں اسی طرح ماقبل پیدائش کا سوال بھی خارج از بحث ہے۔ مغربی فکر کے کلاسیکل مفکرین کے نزدیک انسان اس معنیٰ میں قائم بالذات اور اپنا خالق خود ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم دیکھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ تصور انفرادیت ''اُلوہیّت انسان'' کا مظہر ہے۔ تہذیبِ مغرب کا ایک یہی کلمہ ہے.....لا الٰہ الا الانسان!

انسانی حقوق کے تمام تر تصورات اسی سرمایہ دارانہ عقلیت سے نکلے ہیں اور مغربی فلاسفروں کی اسی جاہلانہ فکر کی روشنی میں انسانی حقوق کا ٹیکسٹ تیار کیا گیا ہے۔ تہذیبِ جدید کے نزدیک ''حقوقِ انسانی کا چارٹر'' جسے یو این او نے اپنے ممبر ممالک پر لاگو کیا ہے، یہ دورِ حاضر کا واحد اور آخری ''حق'' ہے اور ناقابل چیلنج ہے۔ اسی بنیاد پر یو این او کے تمام ممبر ممالک اس چارٹر پر دستخط کرنے کے پابند ہیں۔ یو این او کے کسی ممبر ملک میں ایسی کوئی سی بھی قانون سازی یا اجتماعی سرگرمی بروئے کار نہیں آسکتی جو حقوقِ انسانی کے چارٹر کے خلاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حقوقِ انسانی چارٹر کو سرمایہ دارانہ مذہب کا نصابی صحیفہ ہونے کا درجہ حاصل ہے۔

انسانی حقوق کے چارٹر کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تین بنیادی ارکان ہیں:

(۱) آزادی (۲) مساوات (۳) ترقی

انسانی حقوق کے چارٹر کے مطابق:

(۱)　آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان آسمانی وحی کا محتاج نہیں اور نہ ہی انسان کو کسی مذہب کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ انسان اب دورِ ظلمت (Dark Age) سے نکل آیا ہے۔ اب وہ اپنی عقل کی بنیاد پر اپنے لیے خیر وشر کے پیمانے خود وضع کر سکتا ہے۔ وہ جو چاہنا چاہے چاہ سکتا ہے اور جو کرنا چاہے کر سکتا ہے، کوئی مذہب، عقیدہ اور اخلاقی ضابطہ اس کی چاہت میں حائل نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان خود خدا ہے اور وہ اپنی ہی پرستش کرتا ہے۔

(۲)　مساوات سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کے برابر ہے، علم، بزرگی، مرد ہونا، استاد یا باپ ہونا، فضیلت کا کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح کوئی شخص کسی دوسرے کے مال کو ناحق نہیں کھاتا اور ایک دوسرا آدمی ناحق مال کھانے کو اپنے لیے روا رکھتا ہے تو سرمایہ دارانہ عقلیت میں دونوں کی حیثیت برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب الیکشن ہوتے ہیں تو تمام ووٹروں کا ووٹ یکساں ہوتا ہے۔ عالم وزاہد اور زانی شرابی کا ووٹ برابر تصور کیا جاتا ہے۔ (one man one vote)

(۳)　تیسری چیز ترقی ہے، جس کا مطلب ہے کہ انسان کو اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کمانے پر تمتع فی الدنیا کا حق حاصل ہے۔ چوں کہ انسانی حقوق کے مطابق ہر انسان آزاد ہے کہ وہ جو بھی فکر وعقیدہ رکھے (ریاست اس پر قدغن نہیں لگا سکتی) اس لیے ترقی کی اس دوڑ میں سود، سٹہ، جوا، دھوکہ، فریب، جبر وظلم سب روا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایک عورت اپنا جسم بیچ کر زیادہ سے زیادہ سرمایہ جمع کرنا چاہے تو اُسے اس بات کا حق حاصل ہے۔

اب ہم آتے ہیں جمہوریت کی طرف! جمہوریت، سرمایہ دارانہ نظام کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم .....اور حقوقِ انسانی کے نفاذ کا آلہ کار ڈھانچہ ہے۔ جمہوریت ایسا تنظیمی ڈھانچہ ہے جو جبر کا ایک ایسا ماحول وضع کرتا ہے کہ فرد اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشاء کو ترک کر کے صرف اپنی خواہش اور سرمائے کی بندگی کرے۔

اب ہم جائزہ لیتے ہیں کہ جمہوری سسٹم کی ماہیت کیا ہے؟

جمہوری سسٹم کی پہلی بنیاد انتخابات ہیں، جن میں مختلف لوگ امیدوار بنتے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کے ممبر بنیں گے۔ ریاست کے افراد انھیں مساوی بنیادوں پر ووٹ دیتے ہیں۔ یعنی مرد وعورت، عالم وجاہل، زاہد ومتقی اور چور ڈاکو، زانی شرابی سب مساوی بنیادوں پر اپنے اپنے امیدوار کو ووٹ دیتے ہیں۔ امیدوار بھی انتخابات میں مساوی حیثیت میں حصہ لیتے ہیں۔ اس لیے کہ پارلیمنٹ کا رکن ایک شیخ الحدیث بھی بن سکتا ہے اور چور اچکا، منافع خور، اسمگلر اور قاتلوں کا سرغنہ بھی رکن بن سکتا ہے.....الیکشن کے بعد جو لوگ پارلیمنٹ میں جاتے ہیں۔ وہ پہلے ایک دستور وضع کرتے ہیں (یا پہلے سے ایک وضع شدہ دستور ہوتا ہے جو اصلاً انسانی حقوق کے تابع ہوتا ہے) پھر اسی دستور کی روشنی میں قانون سازی کی جاتی ہے۔ اس سارے عمل میں کتاب اللہ کا کوئی رول نہیں ہوتا۔

[گو کہ پاکستان کے دستور میں ایک ''قرارداد مقاصد'' کے ذریعے پارلیمنٹ کتاب وسنت کی روشنی میں قانون سازی کی پابند ہے مگر اس حقیقت سے جائے فرار نہیں کہ قراردادِ مقاصد کی حیثیت محض ایک ''علامت'' کی ہے۔ پھر اس میں بھی آزادیٔ فرد کے تمام تصورات کو اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ بالآخر حقوقِ انسانی کا، کافرانہ ومشرکانہ چارٹر ہی بالادست ٹھہرتا ہے۔ ہماری نظر میں قراردادِ مقاصد کو محض پاکستان کے مذہبی طبقات کا منہ بند رکھنے کے لیے دستور کے ساتھ نتھی کیا گیا ہے۔]

جمہوری سسٹم میں بیوروکریسی یا انتظامیہ (محکمہ جاتی افراد، پولیس، فوج) اور عدلیہ، یہ تمام حکومتی طبقے سرمایہ دارانہ تصورات اور سرمایہ دارانہ عدل کے قیام ونفاذ کے ضامن ہوتے ہیں..... یوں جمہوری سسٹم کے ذریعے سرمایہ دارانہ جبر کا ماحول پروان چڑھتا ہے جہاں ہر انسان اس بات پر مجبور ہوتا ہے کہ:

☆　اپنے مذہب کو اجتماعی زندگی سے نکال کر انفرادی زندگی تک محدود کر دے۔

☆　عبادت الٰہی کو حتی الامکان کم وقت دے اور سرمائے کی بڑھوتری کے لیے زیادہ وقت صرف کرے۔

☆　اپنے معاشرتی تعلقات کو محدود کرے۔

☆　دینی تعلیمات کو سیکھنے کی بجائے سوشل سائنسز کو زیادہ وقت دے تاکہ وہ سرمائے کی بڑھوتری میں زیادہ بہتر انداز

میں شمولیت کر سکے۔

اس تفصیل کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جمہوریت اپنے ماخذات کی بنیاد پر اسلام سے مکمل طور پر متصادم اور باطل نظریہ ونظام ہے۔اس نظام میں حصہ لینا، ووٹ دینا اور لینا مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر حرام ہے:

الف: جمہوری حکومت کی پہلی بنیاد حاکمیتِ عوام ہے۔جمہوریت کی تعریف ہی یہ ہے:

Government of the people, by the people, for the people.

یعنی عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام پر..... یہ جمہوریت کا پہلا بنیادی اصول ہے جو کھلا کلمۂ کفر ہے۔اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اقتدار کے انکار کے علاوہ انسان کی بندگی کا بھی انکار ہے۔دوسرے لفظوں میں حاکمیتِ انسان کا مطلب انسان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (الانعام)

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (الاعراف)

لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (القصص)

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا (الکھف)

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (الیوسف)

ان آیات کے علاوہ بھی متعدد آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہی حکم وحکومت کے سزاوار ہے۔قانونِ شریعت میں انسان اللہ کا بندہ اور خلیفہ ہے۔اسے یہ حق نہیں کہ خود خدا بن بیٹھے۔بہرحال ان آیات کی روشنی میں جب ہم جمہوری عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو مندرجہ ذیل قباحتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) مُقَنِّن اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔انسان عبد ہونے کے ناتے اس بات کا پابند ہے کہ وہ قوانینِ شریعت کو بلا چون وچرا تسلیم کرے اور ان پر عمل درآمد کرے۔انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ خود قانون ساز بن کر بیٹھ جائے اور حاکمیت الٰہ میں شریک ہو جائے۔ایسا کرنا شرک فی الحکم ہے (یہ بات یاد رہے کہ یہ بات شرک ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود والٰہ بھی مانتا ہو۔اگر وہ حاکمیتِ انسان کا یہ مطلب لے کہ ذاتِ باری کا کوئی وجود نہیں۔وہ خود ہی حاکم ہے تو یہ دہریت ہے جیسا کہ اکثر مغربی ممالک میں اسی بات کا تصور پایا جاتا ہے)

قرآن مجید میں شرک کے بارے میں فیصلہ ہے کہ:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۔بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔(لقمان:۱۳)

دوسری جگہ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:۱۱۶)

''بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔اس کے علاوہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

جمہوریت انسانوں کو یہ حق فراہم کرتی ہے کہ وہ ووٹ کے ذریعے اپنی حاکمیت کو قائم کریں، پارلیمنٹ میں اپنے نمائندے بھیجیں، جو مفادِ عامہ کے مطابق قانون سازی کریں۔ چنانچہ یہ عمل شرک ہونے کے سبب باطل ہے۔

(۲)　جمہوری قوانین کے ماخذ انسانی حقوق کے چارٹر میں انسانوں کا پہلا حق آزادی (Freedom) کو تسلیم کیا گیا ہے۔ آزادی کا یہ حق انسانی حقوق کا بہت خاص حق ہے اور ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ آزادی (اللہ تعالیٰ سے بغاوت، راہِ بندگی سے فرار) کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ آزادیٔ رائے، آزادیٔ اظہار، آزادیٔ مذہب وعقیدہ، آزادیٔ نسواں اور کئی دیگر قسم کی آزادیوں کو اس ایک فارم میں سمو دیا گیا ہے۔ چنانچہ جمہوری پارلیمنٹ میں جو بھی قانون سازی کی جاتی ہے وہ آزادی کی تمام اقسام کو مدنظر رکھتے ہوئے کی جاتی ہے۔ ہم یہ بتا آئے ہیں کہ انسانی حقوق کے چارٹر میں انسانوں کو دی گئی آزادی کا مطلب انکارِ بندگی کے سوا کچھ نہیں۔

قرآنی فکر کے مطابق انسان آزاد نہیں ہے۔ وہ بندہ ہے، اللہ وحدہ لاشریک کا۔ چنانچہ اسے حکم ہے کہ وہ اسی کی بندگی کرے۔ بندگی بھی ایسی جس میں غیر اللہ کی بندگی کا شائبہ بھی نہ ہو:

وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا　لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبہ:۳۱)

''انھیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم دیا گیا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شرک ٹھہراتے ہیں۔''

وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ (البیّنہ:۵)

''اور نہیں حکم دیئے گئے مگر یہ کہ وہ اللہ ہی کی بندگی کریں۔ اس کی خالص اطاعت کے ساتھ بالکل یکسو ہو کر۔''

اسی طرح قرآن مجید میں دیگر کئی مقامات پر اپنی بندگی کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ قرآنی احکام کے بعد کہیں اس بات کی گنجائش نہیں کہ اسلام کے دائرے سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کی طرف اور کسی قسم کے ''ازم'' کی طرف نگاہِ التفات بھی کی جائے۔ انسان کو اگر آزاد تصور کیا جائے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اگر رب کا بندہ نہیں رہا تو شیطان کا بندہ ہے۔ اس لیے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں، انسان اللہ کا بندہ ہو یا شیطان کا!

(۳)　انسانی حقوق کا دوسرا رکن مساوات (Equality) ہے۔ مساوات کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ مرد وعورت، عالم وجاہل، بدکار ونیکوکار، ایک ڈاکو اور متقی انسان سب برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں۔ اسی معنٰی میں ہر انسان کا ووٹ برابر ہے۔ ہر انسان پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا اہل ہے۔ اور ہر انسان ترقی کے عمل میں شریک ہوسکتا ہے۔ انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کے مطابق تمام انسان قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ جب کہ اسلام میں مساوات کا ایسا کوئی تصور نہیں۔ اسلام مرد اور عورت میں فرق کرتا ہے۔ وہ ذمی اور معاہد میں فرق کرتا ہے۔ وہ عالم اور جاہل میں فرق کرتا ہے۔ اسلام ہر شخص کے ہر موضوع پر رائے دینے کا قائل نہیں۔ مرد بیک وقت چار شادیاں کرسکتا ہے، عورت نہیں۔ مرد طلاق دیتا ہے عورت نہیں۔ جمہوریت کا نصابی صحیفہ ''انسانی حقوق کا چارٹر'' ہر انسان کو حق دیتا ہے کہ وہ اپنے لیے جیسا چاہیں خیر وشر کا پیمانہ

تجویز کر سکتے ہیں۔قرآن ان تمام تصورات مساوات کو ردّ کرتا ہے۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے......

وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰت(الآیه) ......لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ (الآیه)...... لَا يَسْتَوِىْ اَصْحَابُ النَّارِ وَاَصْحَابُ الجَنَّه(الآیه) چنانچہ مساوات کی مندرجہ بالافکر اسلام سے مکمل طور پر متصادم وباطل ہے۔

(۳)　انسانی حقوق کے چارٹر کا تیسرا بنیادی رکن ترقی(Progress) ہے۔چونکہ سرمایہ دارانہ علمیت کے پاس موت کے بعد کی زندگی کا کوئی تصور نہیں۔اس لیے انسان کی تمام تگ وتاز کا محور یہی دنیوی زندگی ہے۔چنانچہ انسانی حقوق کے چارٹر کے مطابق ہر انسان کو زیادہ سے زیادہ سرمایہ حاصل کرنے اور سامانِ تعیش جمع کرنے کی اجازت ہے۔تاکہ وہ اسی دنیا کو جنت بنا سکے۔سرمایہ عقلیت میں ترقی کا مطلب سرمائے کی بڑھوتری برائے بڑھوتری اور حرص وحسد کے فروغ کے سوا کچھ نہیں۔بینک،اسٹاک ایکسچینج اسی بڑھوتری کے عمل کو تیز تر کرنے کے ادارے ہیں۔جہاں تکاثر کا عمل دہرایا جاتا ہے۔سود،سٹہ، جوا، دھوکہ وفریب اور ٹیکسز سرمایہ دارانہ معیشت کا خاص ہتھیار ہیں۔ان اداروں سے وابستہ افراد کی زندگی کا محور ومقصد محض پیسہ ہوتا ہے اور وہ ہر اس طریقے کو اختیار کرتے ہیں جس کے ذریعے سرمایہ اکٹھا ہو سکے۔

اسلام اس طرزِ فکر کو بھی ردّ کرتا ہے۔قرآن مجید دنیوی زندگی کو اس معنی میں اہمیت نہیں دیتا کہ انسان لذات کے حصول اور خواہشات نفس کی تکمیل میں لگ کر اپنے مقصدِ اصلی کو بھول جائے اور زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی ہوس میں مبتلا ہو جائے۔بلکہ وہ دنیوی زندگی کو لہو ولعب، دھوکہ وفریب قرار دیتا ہے۔چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌم بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا وَّفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌم وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (الحدید:۲۰)

''جان رکھو! دنیا کی زندگی ......لہو ولعب، زیب وزینت اور مال اولاد کے معاملے میں باہمی تفاخر وتکاثر ہے(اس کی) مثال بارش کی ہے جس کی اپجائی ہوئی فصل کافروں کے دل موہ لے پھر وہ بھڑک اٹھے اور تم اسے زرد دیکھو پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔اور آخرت میں ایک عذاب شدید بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کی ٹٹی ہے۔''

[نوٹ: آزادی، مساوات اور ترقی انسانی حقوق کے باطل چارٹر کے تین بنیادی ارکان ہیں۔اس وقت ہمارا موضوع دوسرا ہے، ان شاءاللہ انسانی حقوق کے چارٹر کا محاکمہ ومحاسبہ عنقریب پیش کیا جائے گا جس سے ہمیں سمجھنے میں مدد ملے گی کہ انسانی حقوق کا چارٹر کیوں کر اسلام سے متصادم، کفر اور بغاوتِ الٰہی پر مبنی ہے۔]

(۵)　قرآن مجید میں فرمادیا گیا ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً......

اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت کے بعد کافرانہ نظامِ حکومت کو اپنی اجتماعی زندگی کا حصہ بنانا اور اس پر مداومت اختیار کیے رکھنا تکمیل دین اور اتمامِ حجت کا انکار ہے۔ تکمیل دین واتمام نعمت کا مطلب ہی یہ ہے کہ سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آغاز ہونے والا دینِ اسلام کا سلسلہ تدریجی مراحل طے کرتا ہوا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر اپنے اوجِ کمال کو پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب ہدایت نازل کردی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچادیا۔ تمام مسلمانوں کے لیے دینِ اسلام کی صورت میں ایک خاص طریقہ اور ضابطۂ حیات متعین کردیا گیا ہے۔ اب اس ضابطے سے باہر نکلنا کسی مسلمان کے لیے روا نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ (الشوریٰ:۱۳)

''اس نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی ہدایت اس نے نوح کو فرمائی اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ مشرکین پر وہ چیز شاق گزر رہی ہے جس کی طرف تم ان کو دعوت دے رہے ہو۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الجاثیہ:۱۸)

''پھر ہم نے تم کو ایک واضح شریعت پر قائم کیا تو تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔''

قرآن مجید کی ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کے لیے طریقۂ زندگی، ضابطۂ حیات، دائرہ کار خواہ انفرادی معاملات ہوں یا اجتماعی معاملات قانون شریعت ہی ہے، اس سے انحراف کی راہیں تلاش کرنا اور کسی دوسرے طریقۂ زندگی کو پسند کرنا جائز نہیں، ایسا کرنا بہت بڑا خسارہ ہے۔ ہمارے خیال میں سرمایہ دارانہ نظام میں شمولیت اختیار کرنا اور اس پورے نظام کو اس طرح اپنے اوپر حاوی کرلینا کہ شریعت معطل ہوجائے، احکامِ دین کھلم کھلا پامال ہونے لگیں اور شعائرِ اسلام کا مذاق اڑایا جانے لگے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ہندو ہوجائے یا عیسائیت قبول کرلے یا بدھ مت اختیار کرلے، اس لیے کہ جمہوری نظام کو قبول کرنے اور اس پر مداومت اختیار کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ شریعت اب چند اجزاء مثلاً عبادات کے علاوہ قابل عمل نہیں رہی۔ اور خلافت کا ادارہ بحالتِ موجودہ ناقابل قیام ہے۔ ظاہر ہے یہ فکر اور یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں سندِ قبولیت حاصل نہیں کرسکتا، بلکہ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (آل عمران:۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔''

آخرت کی نامرادی اور خسارہ کیا ہے، اس کی وضاحت بھی ایک دوسری جگہ ارشاد فرما دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَ مَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَ یَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَ ت مَصِیْرًا (النساء:۱۱۵)

''اور جو کوئی راہِ ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا، مسلمانوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے، جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔''

جمہوری نظام کفار کا طرزِ حکومت وسیاست ہے۔ چنانچہ غیر سبیل المؤمنین ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت آ چکنے کے بعد کوئی دوسری راہ اختیار کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہوئے مؤمنین کے راستے سے الگ راہ نکالنا اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے اور شرک ہر طرح کی برائیوں کا منبع ہے۔ کیوں کہ مشرک اللہ سے کٹ کر اپنی باگ شیطان کے ہاتھ میں پکڑا دیتا ہے۔ ''غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنِ '' کے شرک ہونے کا قرینہ اگلی آیت ہے جس میں مذکورہ آیت (ومن یشاقق الرسول الخ) کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (النساء:۱۱۶)

''بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا، وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''　　(جاری ہے)

قارئین متوجہ ہوں

قارئین کی سہولت کے لیے لفافے پر پتا کے اوپر مدت خریداری مستقل طور پر درج کر دی گئی ہے۔ جن قارئین کا سالانہ زرِ تعاون دسمبر ۲۰۰۷ء میں ختم ہو چکا ہے اور جن کا جنوری، فروری ۲۰۰۸ء میں ختم ہو رہا ہے، ان سے التماس ہے کہ اپنا سالانہ زرِ تعاون ۱۵۰ روپے ارسال کر کے اگلے سال کی تجدید کرا لیں۔

نیز محکمہ ڈاک کی طرف سے منی آرڈر اور وی پی فیس میں ظالمانہ اضافہ کے باعث آئندہ رسالہ وی پی نہیں کیا جائے گا۔ قارئین زر سالانہ اور ایجنسی والے حضرات درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم آن لائن کر دیں اور ہمیں فون یا خط کے ذریعے مطلع فرما دیں۔ شکریہ! (سرکولیشن منیجر)

بنام: ماہنامہ ''نقیب ختم نبوت'' ملتان، آن لائن اکاؤنٹ نمبر: 1-5278-100 بینک کوڈ: 0278، یو بی ایل چوک مہربان، ملتان

یہ مسلسل سازشیں

پروفیسر خالد شبیر احمد

بین الاقوامی سطح پر دشمنانِ اسلام پاکستان کے خلاف مسلسل سازشوں میں مصروف ہیں۔ان سازشوں کا مرکزی کردار اسرائیل اور امریکہ کا ہے۔ یہ دونوں ممالک دنیا کے کسی بھی خطے پر اسلامی معاشرے کو اپنی بقا کے لیے خطرہ تصور کرتے ہیں اسلامی معاشرہ یا اسلامی ریاست، ان کی شان وشوکت، ان کی عظمت وسطوت، ان کی تہذیب وتمدن، ان کی صنعت و حرفت کے لیے ایک ایسا چیلنج ہے جس کا مقابلہ کرنے کی ان میں ہمت ہی نہیں ہے۔ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت کو تباہ و برباد کرنے کا مقصد بھی یہی تھا اور جو کچھ آج پاکستان میں ہو رہا ہے اس کے پیچھے بھی وہی ہاتھ کارفرما ہیں جنھوں نے عراق، افغانستان، فلسطین اور کشمیر میں اپنی سازشوں کے گُل کھلائے اور مسلمانوں کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگین کیے۔ یہ سب کچھ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی ذی شعور انکار تو کیا انکار کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

ادھر اس سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ پاکستان کے ہر دور میں صاحب اقتدار لوگ ان سازشیوں کا ایک مؤثر مہرہ رہے ہیں اور جو کچھ پاکستان میں شروع سے لے کر آج تک ہو رہا ہے اس میں ہمارے طالع آزما رہنماؤں نے وہی کردار ادا کیا ہے جو کردار بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق سے منسوب ہو چکا ہے۔ جن کے بارے میں علامہ اقبال کہہ گئے ہیں:

جعفر از بنگال ، صادق از دکن
ننگِ قوم ، ننگِ دیں ، ننگِ وطن

کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان کا پہلا صدر میر جعفر کی اولاد میں سے تھا، جس کو اسلام اور اسلام کا نام لینے والوں سے اس قدر نفرت تھی کہ اس نے اپنے کتے کا نام مُلّا رکھا ہوا تھا، جس نے اقتدار کے نشے میں سرشار ہو کر کہا تھا کہ میں پاکستان کے تمام علمائے دین کو چاندی کی کشتی میں بٹھا کر سمندر پار بھجوا دوں گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر تدبیر کرنے والے ہیں اسی شخص کے لیے حالات ایسے ہو گئے کہ اسے سمندری جہاز میں سوار ہو کر سمندر پار جانا پڑا اور مرنے کے بعد دفن کے لیے پاکستان کی سرزمین بھی اسے نصیب نہ ہوئی۔ وہ اپنی سسرالی ملک ایران میں دفن ہوا اور سنا ہے کہ اب اس کی قبر پر ایک ''شاپنگ پلازہ'' بن چکا ہے اور اس کی قبر تک دنیا میں موجود نہیں۔ یہ سامانِ عبرت تو ان لوگوں کے لیے ہے جو عبرت حاصل کرنا چاہتے ہیں یا پھر جن کے نصیب میں عبرت ہوتی ہے۔ موجود حکمران ٹولہ سوفی صدی اسی روش اور اسی حکمت عملی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ان کی ایسی

ہی حکمت عملیوں سے ملک اب ایک ایسے خطرناک موڑ پر آ چکا ہے جہاں سے لوٹنا مشکل نہیں تو اتنا آسان بھی نہیں ہے:

حالات کے مقتل میں کھڑا سوچ رہا ہوں
احساس کے زخموں سے کہیں مر ہی نہ جاؤں

اس وقت جو ملک کے حالات ہیں، ان پر لکھنے والے سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں کہ کیا لکھیں، کن کے لیے لکھیں، کس طرح لکھیں؟ اور کیوں لکھیں' اک شعور ہے کہ بے چین کئے رکھتا ہے لیکن اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے بے اختیار دل سے آہ نکلتی ہے کہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں آن پہنچے ہیں اور کہنا پڑتا ہے ؎

نادیدنی کے دید سے ہوتا ہے خونِ دل
بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیے

غم اور دکھ تو اس بات کا ہے کہ تحریکِ پاکستان سے لے کر قیام پاکستان تک اور قیام پاکستان سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ اور اس کے بعد موجودہ حالات تک کیا کیا سازشیں اس ملک کو تباہ و برباد کرنے کے لیے نہیں کی گئیں اور عوام کو بہلانے کے لیے کیا، کیا کھلونے نہیں دیئے گئے۔ کبھی قرارداد مقاصد کا کھلونا تو کبھی اسلامی مساوات کا کھلونا' کہ پچھلے ساٹھ برسوں میں آئین کی زینت تو بنے لیکن عملی جامہ نہ پہن سکے۔

اگر ہم قیام پاکستان سے آج تک کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات واضح ہو کر ابھرتی ہے کہ جس حکمران نے پاکستان میں امریکہ کی مرضی کے مطابق حکومت کی اس کی دنیا بدل گئی وہ بہادر کہلایا، اتحادی قرار دیا گیا۔ اس کی شان میں دن رات امریکہ اور اس کے حواریوں نے قصیدے پڑھے اور پاکستان کے جس حکمران نے اپنے مرضی سے اس ملک کے لیے کوئی کام سرانجام دیا اسے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت، ذوالفقار علی بھٹو اور پھر جنرل ضیاء الحق انہی سازشوں کا شکار ہوئے۔

لیاقت علی خان کی شہادت کی وجہ بھی صرف یہ تھی کہ وہ مسلمان ملکوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتے تھے اور مسلمان ملکوں کے مسائل ایک مشترکہ حکمتِ عملی بنانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ خصوصیت کے ساتھ پاکستان، ایران اور مصر کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک مشترکہ لائحہ عمل ان کے پیش نظر تھا جس کی تفصیل آپ سید نور احمد کی کتاب ''مارشل لا سے مارشل لا تک'' میں پڑھ سکتے ہیں۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی یہ کوشش اتحاد بین المسلمین کی طرف ایک اہم قدم تھا اور ہمارے خیال کے مطابق قیام پاکستان کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ پاکستان کے ذریعے دین اسلام کے نفاذ اور اتحاد بین المسلمین کی تحریک کا کام لیا جائے۔ یعنی پاکستان مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ جس نے پاکستان کا تصور پیش کیا اس کے کلام میں اس کی گواہی موجود ہے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر

علامہ اقبال، جمال الدین افغانی کی تحریکِ اتحاد بین المسلمین سے متاثر تھے اور انھوں نے اپنے کلام کے ذریعے مسلمانوں کو جو سبق دیا ان کا مرکزی نکتہ بھی یہی ہے کہ مسلمان ایک ملک کے حصول کے بعد دنیا کے مسلمانوں کو پرچم اسلام تلے جمع کر کے قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کریں اور اگر یہ مقصد پیش نظر نہیں ہے جیسا کہ اب نہیں ہے، تو پھر قیام پاکستان کا بنیادی مقصد ہی ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور اسی مقصد کے حصول کو روکنے کے لیے ہمارا ملک نت نئی سازشوں کا شکار ہوتا چلا آ رہا ہے۔

اسی مقصد کو ختم کرنے کے لیے ایک نئی سازش ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ ہے۔ جو اس وقت کے پاکستانی حکمران پاکستانیوں کو دے رہے ہیں۔ تاکہ اتحاد بین المسلمین کا تصور پاکستانیوں کے دل و دماغ سے نکال باہر کیا جائے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ جنھوں نے پاکستان کی جغرافیائی حدود کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہے، وہی ملک کی نظریاتی حدود پر حملہ آور ہیں۔ اور یہ بھی پاکستان کے خلاف ایک سازش ہے جس کا مقابلہ کرنا اس وقت پاکستان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اس سازش کے برگ و بار دن بدن کُھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور یہ اسی سازش کا نتیجہ ہے کہ عوام اور فوج کے درمیان نفرت کی ایک وسیع خلیج پیدا کی جا رہی ہے۔ تاکہ بوقت ضرورت دونوں ایک دوسرے کی مدد کے سرے سے قابل ہی نہ رہیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں عوام اور فوج کا تعاون ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ جدید دور میں جنگ عوام کی مدد سے ہی جیتی جاتی ہے۔

امریکہ کے اربابِ بست و کشاد نے ایسی ہی شاطرانہ چالوں اور سازشوں سے روس جیسی عظیم طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ ستر سال پر محیط سازشوں کا ایک سلسلہ ہے جو روس کو نیچا دکھانے کے لیے امریکہ بروئے کار لایا اور آج انہی سازشوں کی وجہ سے امریکہ پوری دنیا کا بلا شرکتِ غیرے مالک بنا بیٹھا ہے۔ روس کی امریکہ کی طرف سے مخالفت، سامراجیت اور اشتراکیت کے درمیان معرکہ آرائی تھی اور اس معرکہ آرائی کے آخری حصے کو گورباچوف کے کردار کی وجہ سے نہایت اہمیت حاصل ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ امریکن لالی کا یک اہم کردار تھا۔ روس کا ایٹم بم دھرا رہ گیا اور روس کی فوجیں دیکھتی رہ گئیں، سازش مکمل ہوگئی۔ روس اتنی خاموشی سے ٹوٹ گیا کہ اتنی خاموشی سے شیشے کا گلاس بھی نہیں ٹوٹتا۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہماری صفوں میں بھی کہیں ''گورباچوف'' تو نہیں گھسے ہوئے کہ سازشیں اسی لیے خطرناک ہوتی ہیں کہ ان میں مخلص لوگ بھی ان گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتے جو ملک اور قوم کے لیے انتہائی خطرناک ہوتی ہیں۔

اشتراکیت نواز ریاست کے ساتھ امریکہ کا یہ سلوک ہمیں ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے کہ اسلام تو سامراجیت کے خلاف اشتراکیت سے زیادہ شدید ہے۔ بقول چودھری افضل حقؒ

''اشتراکیت کو اسلام سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے''

اگر اشتراکیت امریکہ کے لیے قابلِ معافی نہیں تو پھر اسلام کیسے قابل معافی ہوسکتا ہے۔ یہ جو کچھ اس وقت

ہمارے ملک میں ہو رہا ہے ان کی غرض و غایت بھی پاکستان کو توڑنے یا پھر اسے اس قدر کمزور کرنا ہے کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے یہ معرضِ وجود میں آیا تھا انھیں حاصل کرنے کے قابل نہ رہے۔ آج ملک کا دستور قید ہے۔ عدلیہ قید ہے ایٹم بنانے والا قید ہے، ایٹم بم چلانے والا انتخاب سے باہر ہے، پاکستان کی سرزمین بحرانوں کی سرزمین میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ بجلی کا بحران، آٹے کا بحران، پانی کا بحران، چینی کا بحران، سیاسی قیادت بے دست و پا۔ انسان پریشان حال، ہر طرف قتل و غارت، ڈاکہ، رہزنی اور مہنگائی۔ جان، مال، عزت، آبرو کچھ بھی محفوظ نہیں، عدل کرنے والے خود عدل و انصاف کو ترس رہے۔ یہ کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہ وہی کچھ ہے جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون کی ابتداء میں کر دیا ہے۔

۲۷ر دسمبر کو بے نظیر قتل کر دی گئی، اس کے بعد لاہور میں خودکش حملہ پولیس پر کیا گیا۔ امریکی مداخلت ملکی مسائل میں دن بدن بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ امریکی سینیٹر مسٹر برمین کا یہ بیان قابلِ غور ہے کہ اگر انتخاب صاف اور شفاف نہ ہوئے تو ملک کے تقسیم ہونے کا خطرہ ہے یا پھر امریکی کانگریس اس کے خلاف ایکشن لے گی۔ ان حالات کے باوجود ہمارے صاحب اقتدار لوگ' اقتدار کے نشہ میں مست ''ہمچو ما دیگرے نیست'' کا نعرہ لگاتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچاتے، ان کے خدمت میں گزارش ہے۔ ؎

اونچی اڑان بخت میں ہوتی نہیں سدا
قدموں کو رکھ زمین پہ تُو دل کو اپنے تھام

امیر شریعتؒ کا قول ہے کہ

''حقیقتیں تسلیم کر لینی چاہئیں کہ اس سے انسان کو راحت نصیب ہوتی ہے۔''

ان تمام مسائل اور ان تمام سازشوں کا سدِ باب صرف اس بات میں ہے کہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ شریعتِ محمدی کے نفاذ کا مطالبہ کرنے والے اب ایک طاقت ہیں۔ ان کے طریق کار سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے مطالبے سے اختلاف تو سرے سے ممکن ہی نہیں کہ اس کا اعلان دستور میں موجود ہے اور طاقت کو طاقت کے ذریعے کچلنے کی بجائے انھیں مذاکرات کی میز پر بلا کر ان سے بات چیت کا آغاز ہونا چاہیے۔ اگر یہ شریعتِ محمدی کے نفاذ والی طاقت' طاقت کے ذریعے کچلی جا سکتی تو اب تک ختم ہو کے رہ جاتی۔ جو کام آپ آٹھ برسوں میں نہیں کر سکے وہ آئندہ کیسے ممکن ہے؟ لہٰذا ان سے مفاہمت اور مذاکرات ہی ایک واحد ذریعہ ہے جس سے ہم ان سازشوں سے بھی گلو خلاصی کر سکتے ہیں اور نفاذ دین کے وعدے کو بھی پورا کر سکتے ہیں۔ جو وعدہ آپ قیام پاکستان سے پہلے پاک و ہند کے مسلمانوں سے کیا تھا۔ ؎

جس صبح کا وعدہ تھا اس دیس کے لوگوں سے
اے کاش کبھی خالدؔ وہ بھی تو سحر آئے

(۱۴ر جنوری ۲۰۰۸ء)

آزمائش کی گھڑی

محمد عمر فاروق

قوموں کی زندگی میں عروج وزوال آتے رہتے ہیں، قیادت اگر مخلص ہوتو مشکلات کی گھڑیاں، راحت وسکون میں باسانی بدل جاتی ہیں، وگرنہ قومیں ذلت کے گڑھوں میں دب کر بے نام ہوجاتی ہیں۔ وطن عزیز آج کل شدید بحرانوں کی لپیٹ میں ہے، ایٹمی اثاثے دشمن کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے ہیں، سوات اور وزیرستان کے علاقوں میں امریکی سامراج آپریشن کے پردے میں اس حساس علاقے میں مستقل قیام کے لیے پرتول رہا ہے۔ سیاسی خلفشار جان بوجھ کر پیدا کیا جارہا ہے تاکہ پاکستان خانہ جنگی کا شکار ہو اور بیرونی قوتوں کو ملک کے اندر مداخلت کرنے کا جواز میسر آئے۔ بے نظیر بھٹو کا قتل اسی بیرونی ایجنڈے کا شاخسانہ ہے دھماکے، بدامنی، اور قتل وغارت گری نے پوری قوم میں خوف وہراس اور سراسیمگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ یہ تمام تر اقدامات اس لیے بروئے کار لائے جارہے ہیں تاکہ پاکستانی قوم کو نفسیاتی لحاظ سے مفلوج کر کے کیموفلاج کیا جاسکے۔ یہ فتنہ سامانیاں اگر ہمارے اتحادی دوستوں کی عطا کردہ ہیں تو ہمارے حکمرانوں کی اس نیم جان قوم پر نوازشات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔

پہلے چینی کا بحران لایا گیا، اب اس زرعی ملک کے عوام گندم کے ایک ایک دانے کو ترس رہے ہیں، لوگ بھوک سے مجبور ہوکر خودکشیوں پر اتر آئے ہیں، پٹرول ڈیزل، گیس اور بجلی کے نرخ آسمان سے باتیں کررہے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتیں عوام کے بس سے باہر ہوگئی ہیں۔ سوڈیڑھ سو کی دیہاڑی والا مزدور دو وقت کے کھانے سے محروم کردیا گیا ہے ہمارے ارباب اختیار جو ہر چھوٹی سی چھوٹی بات میں بھی امریکہ کی پیروی اور نقل کرنے کو روشن خیالی سمجھتے ہیں کیا انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ امریکہ میں کھانے پینے کی اشیاء کے نرخ آج بھی وہی ہیں جو تیس سال پہلے تھے وہاں ڈیری کی مصنوعات کا بھی یہی حال ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ عوام کی زندگی کو معاشی مسائل کی تلخیوں میں غرق کردیا گیا ہے اب صورت حال یہاں تک آپہنچی ہے کہ لوگ جس وجان کا رشتہ برقرار رکھنے کی تگ ودو میں ہانپ رہے ہیں، انھیں کچھ خبر نہیں کہ ملک میں جمہوریت کا راج ہے یا ڈکٹیٹرشپ کی حکمرانی ہے انھیں معلوم نہیں کہ چیف جسٹس افتخار چودھری اپنی مسند پر فائز ہیں یا اپنے گھر سے بے گھر کیے جارہے ہیں، انھیں کون بتائے کہ انتخابات کی تاریخ سر پر آگئی ہے اور انھیں اپنا ووٹ ڈال کر اپنا حق رائے دہی استعمال کرنا ہے۔ انھیں اتنی فرصت کہاں کہ وہ سیاسی عمل اور بیرونی حالات پر ایک نظر ڈال سکیں۔ انھیں بس اتنا پتا ہے کہ انھیں فاقہ بھری رات کاٹ کر صبح سے شام تک بیوی بچوں کے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے

اپنے فاقہ زدہ جسموں کو مشقت کی بھٹی میں جھونکنا ہے اور یہ سلسلہ کولہو کے بیل کی طرح شب و روز جاری رہنا ہے ''سب سے پہلے پاکستان'' کے نعرے اور حکمرانوں کے سات نکاتی ایجنڈے سے بجھے ہوئے چولہے اور بے جان جسموں میں حرارت نہیں دوڑائی جاسکتی۔ لوگ امن و اسکون چاہتے ہیں روزگار کے خواہشمند ہیں، بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے خواہاں ہیں عوام کی ان خواہشات کو پورا کرنا ارباب اختیار کا فرض اولین ہے جو حکومت دکھی دلوں کو سکھ، چین نہیں دے سکتی اسے حکومت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اہل اقتدار رعایا کی ضرورتوں کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں اگر وہ کوتاہی اور غفلت کو شعار بنائیں گے تو وہ حشر کی پیشی کے روز اللہ کے حضور اپنا جواب سوچ رکھیں۔

ایک ذمہ داری ان اصحاب پر بھی عائد ہوتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے دولت و ثروت سے مالا مال کر رکھا ہے غریبوں اور تنگ دستوں پر موجود دور میں جو کڑا وقت طاری ہے اس آزمائش کی گھڑی میں اہل زر کو آگے بڑھ کر اتفاق فی سبیل اللہ کی عملی مثال قائم کرنا وقت کا ناگزیر تقاضا ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ یوٹیلٹی سٹوروں پر قوم کی ماؤں، بیٹیوں، بہنوں اور ضعیف و ناداروں کی لمبی قطاروں کو اپنی دولت کی تقسیم کے ذریعے کم سے کم کرنے کی کوشش کریں ان کی سخاوت اور ایثار سے غریبوں کی اجڑی ہوئی دنیا پھر سے آباد ہوسکتی ہے جسم و جان کے ٹوٹتے سلسلے بحال ہوسکتے ہیں۔ فاقہ زدہ جانیں توانا اور صحت کی نعمتوں سے ہمکنار ہوسکتی ہیں کون ہے جو اس دنیا میں ہی جنت کمانے میں سبقت حاصل کرے یقیناً ایسے ایثار پیشہ اور دردمند سرمایہ دار افراد سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جو ملک و قوم پر طاری اس امتحان اور آزمائش کو ٹال سکتے ہیں۔ اس قوم کا جو فرد پچیس لاکھ روپے کی گائے کی قربانی کرسکتا ہے بے شک وہ ہزاروں گھرانوں کی کفالت کی ذمہ داری بھی آسانی سے اٹھا سکتا ہے۔ اگر حکمران اور مخیّر حضرات مل کر مشکلات میں گھری ہوئی پاکستانی قوم کی دادرسی کا عزم کرلیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خزاں کے دن بہار میں نہ بدل جائیں، صرصر کے تھپیڑے بادصبا کے جھونکوں سے مات کھا جائیں اور اس بدنصیب قوم کو معاشی مسائل سے آزادی ملے اور وہ بھی باوقار قوموں کی صف میں سینہ تان کر کھڑی ہوسکے، کیونکہ معاشی ناہمواری اور تنگ دستی سے نجات میں ہی ملک و قوم کی ترقی کا راز مضمر ہے اور یہی وہ کلیدی نکتہ ہے جو خوشحالی اور خوش بختی کی راہوں کے لیے سنگ میل ہوا کرتا ہے۔

وزارت سے پہلے وزارت کے بعد

سیف اللہ خالد

داستان کوئی بہت پرانی نہیں۔ کہانی سنانے والے سارے کردار زندہ ہیں۔ انھیں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا جب ایک طویل عرصے بعد ان کے دہن نے گوشت اور روغن کو چکھا ورنہ وہ بھول چکے تھے کہ سوکھے ٹکڑوں، ہری مرچوں اور کچی پیاز کے سوا بھی کوئی ذائقہ ہے۔ وہ ناامید تھے کہ شاید ہی زندگی میں دوبارہ لذت اور سہولت کا کھانا نصیب ہو سکے گا۔ بلکہ وہ زندگی سے بھی ناامید تھے۔ ایسے میں پہلا پرتکلف کھانا وہ کیسے بھول سکتے ہیں۔ جب کھانا یاد ہے تو کھلانے والے کا نام بھی حافظے کی لوح پر محفوظ ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب طالبان کا ساتھ دینے والے نوجوان حکومت پاکستان کی پالیسی کا یوٹرن نہ سمجھ پائے اور مجرم ٹھہرے۔ سقوطِ کابل کے بعد افغانستان کے زنداں ان کا مسکن بنے۔ وہی عبرتناک قید خانے جہاں انسانیت سوز اذیتیں معمول تھیں۔ جن کی داستانیں آج بھی انسانیت کو شرمندہ کر دیتی ہیں۔ ان میں غالب تعداد تو ان کی تھی جو سقوط کابل کے بعد پکڑے گئے اور وہ بھی تھے جن کو شمالی اتحاد کی سپاہ نے اس سے قبل محاذوں سے یا دورانِ سفر پکڑا تھا۔ اِنہی دنوں حکومتِ پاکستان کی کوششوں سے ان قید خانوں سے دوسو کے قریب قیدیوں کو رہائی ملی تو چھان پھٹک کی خاطر پشاور جیل میں ٹھہرایا گیا۔

شمالی اتحاد کی قید سے رہائی پانے والے یہ پاکستانی نوجوان جیل پہنچے تو انھیں حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب معلوم ہوا کہ اس جیل میں قید ایک صاحب ثروت نے ان کے لیے مرغ و ماہی کا بندوبست کیا ہے اور ایک پرتکلف ضیافت ان کی منتظر ہے۔ نہ صرف اعلیٰ درجے کا کھانا بلکہ مہمان قیدیوں کو ایک ایک سوٹ اور نقدی بھی دی گئی۔ ضیافت تین روز تک چلی جس نے دشمن کی قید اور وطن کی جیل کا فرق واضح کر دیا۔ یہ قیدی چند دن بعد رہائی پا گئے مگر انھیں ضیافت دینے والا آفتاب شیر پاؤ یاد رہا۔ ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے وہ ہمیشہ محبت سے ذکر کرتے رہے۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اِنہی حرماں نصیب قیدیوں میں سے ایک نے سوال کیا کہ ذرا معلوم کر دیں یہ وہی شیر پاؤ ہیں جو جیل میں تھے یا کوئی اور ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ ہیں تو وہی مگر اب وزارت داخلہ کا قلمدان ان کے ہاتھ میں ہے اس لیے ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ شاید ان کی اس ضیافت کی خبر کہیں اور بھی پہنچی تھی

جوانھیں اپنے دورِ اقتدار میں اس کا ازالہ کرنا پڑا۔

آفتاب احمد شیر پاؤ اب پھر اقتدار میں نہیں۔ وزارت داخلہ کا قلمدان اب قصہ ماضی ہے۔ اقتدار کے صبح وشام تاریخ کی دھول میں پڑے ہیں۔ ملک کے طول وعرض میں آپریشن، پکڑ دھکڑ، مار دھاڑ اور اس پر ان کے اخباری بیانات، تبصرے اور تجزیئے، سب کچھ تاریخ کے بے رحم اوراق میں محفوظ ہے مگر آفتاب شیر پاؤ پھر سے اپنے ماضی کی طرف مراجعت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کل تک ہر دہشت گردی کو بیت اللہ محسود کے کھاتے میں ڈالتے تھے، آج کہتے ہیں کہ تحقیقات کے بغیر الزام نہ لگایا جائے۔ کل تک انتہا پسندی کو کوستے تھے، آج فرماتے ہیں ملک میں بڑھتے ہوئے خودکش حملے، لال مسجد آپریشن کے سبب ہیں۔ ان کی فکر میں ۱۸۰ ڈگری کا فرق دکھائی دے رہا ہے۔ وہی بات جو کل ان کے مخالفین کہتے تھے اور ان سے ناراض رہتے تھے، آج خود ان کی زبان سے ادا ہو رہی ہے۔ پشاور جیل میں ان کی ضیافت کھانے والے پھر سے حیران ہیں کہ ان کے ''میزبان'' شیر پاؤ آخر اتنے برس کہاں چھپے رہے۔ اگر یہی تھے جو وزارت داخلہ کا قلمدان رکھتے تھے تو مؤقف میں اتنا فرق کیوں؟ سوال کرنے والے ''مہمانوں'' کو جواب تو ان کے ''میزبان'' شیر پاؤ ہی دے سکتے ہیں۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ بطور وزیر داخلہ ان کے خیالات نظریاتی نہیں اقتصادی اور مفاداتی تھے۔ ان کا رول محض ٹیپ ریکارڈر کا تھا۔ اب وزارت کا بوجھ ہٹا ہے تو نیچے سے پھر اصلی پٹھان نکل آیا ہے مگر ان کے مخالفین کو اس سے اتفاق نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اقتدار میں ان کی گفتگو اگر مفاداتی اور محلاتی تھی تو اب بھی ان کے بیانات خالصتاً ''جان بچاؤ'' پروگرام کا حصہ ہیں اور وہ حملہ آوروں کو باور کروا رہے ہیں کہ میں تو تمہارے ساتھ ہوں تمہارا آدمی ہوں۔'' اگر یہ سچ ہے تو سوال یہ ہے کہ جن حلقوں کو وہ پیغام دے رہے ہیں کیا وہ اس پیغام کو تسلیم کر لیں گے؟ دوسرے یہ کہ آئندہ وزیر داخلہ کے لیے اس عمل میں کیا سبق پوشیدہ ہے؟ اور آئندہ کے وزیر داخلہ کا بعد از وزارت کیا مستقبل ہوگا؟ غور وفکر کا مقام ہے۔ ابھی سے سوچنا چاہیے کہ وزارت سے پہلے اور وزارت کے بعد اور پھر اب کے نظریات میں اتنا بُعد کیوں؟ صاحب اختیار ہو کر حقائق چھپانا اتنا ضروری کیوں ہو جاتا ہے؟ حقائق کے برعکس فیصلے مجبوری کیوں بن جاتے ہیں؟ جن پر بعد میں وضاحتیں جاری کرنا پڑتی ہیں۔

ماہانہ مجلس ذکر واصلاحی بیان

ابن امیر شریعت
حضرت پیر جی
سید عطاء المہیمن بخاری
دامت برکاتہم
(امیر مجلس احرار اسلام پاکستان)

3 فروری 2008ء
اتوار بعد نماز مغرب

دفتر احرار 69/C
وحدت روڈ نیو مسلم ٹاؤن لاہور

نوٹ: ہر انگریزی ماہ کی پہلی اتوار کو بعد نمازِ مغرب مجلس ذکر واصلاحی بیان ہوتا ہے

تحریک تحفظ ختم نبوت (شعبہ تبلیغ) مجلس احرار اسلام لاہور　فون: 042-5865465

الیکشن ۲۰۰۸ء
جمہوری عمل یا امریکی عزائم کی تکمیل کا ذریعہ

محمد مختار عمر
محمدی شریف (ضلع جھنگ)

پاکستان، ایٹمی قوت کی حامل، ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اس میں اسلامی تعلیمات سے سرشار مدارس کا ایک جامع نظامِ تعلیم وتربیت رائج ہے۔ اور ساتھ ہی جہادی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ یہ صورتِ حال دنیائے کفر اور واحد سپر پاور امریکہ بہادر کے لیے ناقابل برداشت ہی نہیں بلکہ ناقابل معافی جرم بھی ہے۔ اس جسارت کے نتیجے میں ان کی نیندیں حرام ہوگئی ہیں۔ اور انجانے خطرے کی گھنٹیاں سوتے جاگتے ان کے دماغوں کے دریچوں میں بجتی اور ان کا آرام وسکون غارت کرتی رہتی ہیں۔ اس بات نے ان کی ترجیحات میں اوّلیت کا درجہ حاصل کرلیا ہے کہ پاکستان کو ایک ناکام ریاست بنانے کے چھوٹے چھوٹے جزیرے نما ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے خلاف گھناؤنی سازشوں کا ایک جال سا بُن دیا گیا ہے جس کے پھندوں میں ہمارے حکمران اور سیاسی ومذہبی رہنما بری طرح پھنس کر رہ گئے ہیں۔

آج ہماری قوم کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے عوام وخواص نے قومی وملکی مفادات پر اپنے ذاتی، جماعتی، علاقائی مفادات اور خواہش اقتدار کو ترجیح دینا شروع کردیا ہے اور اس کے مقابل قومی وملکی مفادات ایک بے معنیٰ و بے توقیر سی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ قومی فکر کا خاتمہ ہماری تباہی وبربادی کا سبب بن سکتا ہے۔ صد افسوس کہ چھوٹے چھوٹے مذہبی اور علاقائی مفادات کا تحفظ کرنا ہم اپنا فرض عین سمجھنے لگ گئے ہیں اور ملکی مفاد ہمارے وہم وگمان میں نہیں آرہے۔ بلکہ ایسی سوچ کے حامل افراد ہمارے معاشرے میں بے وقوف اور عقل سے عاری تصور کیے جانے لگے ہیں:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

سرطان کی طرح یہ ایک ایسا خطرناک مرض ہے جو ہمارے جسدِ قومی کو گھن کی کھائے جارہا ہے۔ ہمارے حکمران اور رہنمائے ملک وملت اس قابل رحم ملک کے ساتھ جو سلوک روا رکھے ہوئے ہیں، اس کی بقا کیسے ممکن ہے؟ اس کی سالمیت کا راز تائیدِ ایزدی میں مضمر ہے۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس کی سچائی سے صرفِ نظر کرنا ناممکن ہی نہیں بلکہ ناقابل معافی جرم ہے۔

امریکی عزائم کی تکمیل کے لیے نام نہاد الیکشن ۲۰۰۸ء کا انعقاد ہورہا ہے۔ جس طرح ۱۹۷۰ء کے الیکشن کی صورت میں بنگلہ دیش معرضِ وجود میں لایا گیا تھا، اسی طرح موجودہ انتخابات بھی کچھ خاص مقاصد کی تکمیل کے لیے کرائے جارہے ہیں۔ امریکی پالیسی سازوں کی ترتیب میں پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق پاکستان پیپلز پارٹی اوّل پوزیشن پر دوسرے

درجے میں مسلم لیگ (ن) اور تیسرے درجے میں ق لیگ لائی جائے گی۔ اس بندر بانٹ میں بائیں بازو اور دیگر اتحادی جماعتوں کو اپنا اپنا حصہ بقدر جثہ دیا جائے گا۔ اس میں ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ پورے ملک میں قومی اسمبلی سے کل سات سے آٹھ سیٹیں حضرات علماء کرام کے دامن ''بے داغ'' میں ڈالی جا رہی ہیں۔ چونکہ الیکشن ۲۰۰۲ء کے موقع پر حکمرانوں کی نظرِ عنایت میں کچھ زیادہ وسعت آجانے کی وجہ سے شیخ حضرات کو ایک حد سے زیادہ حصہ مل گیا تھا جس کے نتیجے میں بڑے شیخ صاحب وزارتِ عظمیٰ کے خواب دیکھنے لگے..... اب ان کو اپنی اوقات تک محدود کرنا بھی محل نظر ہے۔ الیکشن کے فوراً بعد ان سیاسی جماعتوں کی Commitment کے باوجود مشرف اور امریکی مفادات کا محافظ ایک ایسا گروپ تشکیل دیا جائے گا جو ہر قسم کے ملکی و قومی اور مذہبی مفادات سے بے نیاز ہو کر ایسے کڑے وقت میں کام دے گا جب کچھ ایسے فیصلے قومی اسمبلی سے پاس کرانے کا مرحلہ آئے گا۔ جب کئی ایک ارکان اسمبلی کی غیرت ملی جوش مارنے پر مجبور ہو گی تو اس نازک گھڑی میں ان وفا کے پتلوں سے کام لیا جائے گا۔ یہ گروہ تمام سیاسی جماعتوں اور آزاد ارکان اسمبلی میں سے چنا جائے گا..... یاد رہے یہ ترتیب سانحہ راولپنڈی سے قبل کی ہے۔ اب اس میں کچھ ترمیم ہو جائے گی۔ کیوں کہ حالات کچھ اور کروٹ لے رہے ہیں۔ اب ذرا امریکی عزائم پر نظر ڈالیں جس کے لیے یہ ڈرامہ رچایا جا رہا ہے تا کہ مظلوم و بے بس عوام اپنے پیارے وطن پاکستان کے ساتھ اپنے ہی لیڈروں اور حکمرانوں کی پالیسیوں کے سبب دو دو ہاتھ ہونے سے قبل آگاہ رہیں کہ ان پر اور ان کے وطن عزیز پر کیسی افتاد آنے والی ہے۔

دنیا کا یہ منفرد ملک پاکستان ہے جو اپنے ہی مہربانوں کے ہاتھوں مشقِ ستم بن گیا ہے۔ اپنے ہی کرم فرماؤں نے اس کے جسدِ نیم جان پر کھڑے ہو کر سودے بازی شروع کر رکھی ہے۔ کسی قدر بے وفائی اور سنگ دلی ہے کہ جس وطن عزیز کی بدولت ان کو اقتدار و اختیار ملا جس کے وجود کے طفیل یہ لوگ گونا گوں نعمتوں سے نوازے گئے، اسی کی سالمیت کو داؤ پر لگانے پر تل گئے ہیں۔

کشمیر کے حصے بخرے کر کے اس کو یونائیٹڈ سٹیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ آزاد کشمیر مقبوضہ جموں و کشمیر کے کچھ علاقے اور لداخ کے بعض علاقے ملا کر اسرائیل طرز کی ایک سٹیٹ قائم کی جائے گی۔ جس کو بعض لوگ قادیانی اور بعض اسماعیلی سٹیٹ کا نام دے رہے ہیں۔ یہ مجوزہ سٹیٹ پہلے پہل اقوام متحدہ کی زیر نگرانی چلائی جائے گی اور آگے چل کر براہِ راست امریکہ کے زیر انتظام ہو گی۔ اس تمام منصوبے کی تکمیل اور منظوری الیکشن ۲۰۰۸ء کے نتیجے میں وجود میں آنے والی قومی اسمبلی سے کرائی جائے گی۔ مجوزہ سٹیٹ ایشیاء میں امریکی مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری بھی نبھائے گی۔ رہے ایٹمی اثاثے تو یہ پہلے ہی ایک غیر ملکی ایجنسی کی تحویل میں دیئے جا چکے ہیں۔ اب اس کو رول بیک کرنے کی منظوری کا کارنامہ اس اسمبلی سے کرایا جائے گا۔

بعض واقفانِ حال تو یوں بیان کرتے ہیں کہ پاکستان میں آنے والا گزشتہ زلزلہ کسی قدرتی آفت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایٹمی عناصر میں کچھ چیزوں کے تلف کرنے کا ردّعمل تھا جس سے بڑے پیمانے پر پھیلنے والی تباہی کو قدرتی زلزلہ کا نام دیا گیا۔ ماہرین فلکیات کی آراء کے مطابق زلزلے عمومی طور پر جس رخ پر آتے ہیں، یہ پراسرار و خوفناک زلزلہ اس کے الٹے رخ پر تھا۔ واللہ اعلم۔ کہاں تک حقیقت ہے اور کس قدر افسانہ! اس کے علاوہ جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان تک امریکی رسائی، قادیانی گروہ کو قانونی طور پر کفر کے بندھن سے آزاد کرانا اسلامی اقدار کا ملیامیٹ کرنا، دینی مدارس کی بندش، جہادی قوتوں کا خاتمہ۔ اس نوع کے دیگر امور بھی اس اسمبلی جو کہ ''آزاد و شفاف الیکشن'' کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آنے والی قابلِ فخر پارلیمنٹ ہو گی، اس

فورم سے پاس کرائے جائیں گے، اس طرح جمہوریت کی نیلم پری کا سایۂ عافیت اور عوام کی نام نہاد مہر (جمہوریت) ثبت کر کے فوجی آمریت کا داغ صاف کر دیا جائے گا۔ اس حمام میں سب ننگے ہیں اور کوئی دوسرے کو مورِ دِالزام نہ ٹھہرا سکے:

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

اس کے بعد وطن عزیز کے مزید حصے بخرے کرنے کے منصوبے کی تکمیل کی جائے گی۔ کولہو کے بیل کی طرح اس کی گردشِ لاحاصل میں پوری قوم سرگرداں رہنے پر مجبور ہے۔ غربت کا مارا یہ ملک ایک ایسے طلسم کدہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے، جس میں تمام طبقۂ فکر کے لوگ مئے نوشی کے بعد مخمور پیارے وطن کے جسدِ عزیز پر کاری ضرب لگائے جا رہے ہیں، وائے افسوس! یہ کیسی قابل رحم دھرتی ہے جس کی سرزمین پرائی جنگ میں جھونک دی گئی ہے، جس کے مرنے اور مارنے والے اس دھرتی کے سپوت، ہتھیار اور گولی اس کی اپنی، گویا نقصان تمام تر پاک وطن کا اور مفادات سے دشمن جھولیاں بھر رہا ہے۔ اپنی فوج اپنا ملک فتح کرنے پر مجبور، دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست سمجھ لیا گیا ہے، تاریخ انسانیت جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے:

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

حکمرانوں اور لیڈر صاحبان سے میری ایک ہی نہایت دردمندانہ اپیل ہے کہ یہ ملک آپ کا، میرا اور سولہ کروڑ عوام کا مشترکہ ہے۔ یہ اگر قائم رہے گا تو آپ کا اقتدار آپ کے ذاتی و جماعتی مفادات باقی رہیں گے۔ اگر خدانہ کرے یہ ملک باقی نہ رہا تو آپ کے مفادات اور عزائم خاک میں مل جائیں گے۔ خدارا اس مظلوم ملک پر رحم کھائیں، اپنی آنے والی نسلوں پر ترس فرمائیں، اپنے ذاتی اور جماعتی مفادات کو ملکی و قومی مفادات پر قربان کر دیں اور اس ملک کی بقاء کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ آپ کے مفادات اور اقتدار و حکمرانی اس ملک کے وجود کے ساتھ منسلک ہیں ورنہ:

تمہاری داستاں تک نہ ہوگی داستانوں میں

یہ ملک امریکہ کے ہاتھوں وجود میں نہیں آیا اور نہ ہی امریکہ اس کو ختم کر سکتا ہے۔ میرے رب کریم نے اس کو وجود بخشا، وہی اس کو قائم و دائم رکھ سکتا ہے۔ ہمارے لیڈر اور حکمران اس غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں کہ پاکستان کا اقتدار امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ غلط سوچ ذہن سے نکال دیں، اقتدار و اختیار رب العالمین کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اقتدار امریکہ کے ہاتھ میں ہوتا تو شاہ ایران ہرگز ملک بدر ہونے پر مجبور نہ ہوتا۔ عوام و خواص اللہ کریم کی طرف رجوع فرمائیں، گناہوں کی معافی طلب کریں، رب کریم بڑا غفور و رحیم ہے، وہ معاف کرنے کو پسند فرماتا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے

اس کے سوا چارہ کار نہیں۔ یہ ملک ان شاء اللہ قائم رہے گا، توبہ کرنا اور قربانی شرطِ اوّل ہے۔ امریکہ کو خدا ماننے والے سن لیں، خدا کی لاٹھی حرکت میں آنے والی ہے، پکڑ سے پہلے توبہ کر لیں، نجات یقینی ہے، بشرطیکہ اللہ کریم کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں، امریکہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں، یہ بات خدا کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے، اگلے دو ماہ بڑے اہم ہیں، امریکہ اور امریکہ کو خدا ماننے والے اکٹھے ہو جائیں گے، ان شاء اللہ العزیز، سالوں نہیں دنوں کی بات ہے۔ واللہ اعلم!

مولانا ابوالکلام آزاد اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری

بنتِ امیر شریعت سیدہ اُمّ کفیل مدظلہا

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے اباجی کو بے پناہ عقیدت تھی۔ جدوجہد آزادی میں تقریباً تیس برس مولانا آزاد کی رفاقت حاصل رہی۔ مجلس احرارِ اسلام کے قیام (۱۹۲۹ء) سے پہلے کانگریس کے اسٹیج سے کئی تحریکوں میں وہ مولانا کے ہم سفر رہے۔ تحریک خلافت (۲۱۔۱۹۱۹ء) میں بہت زیادہ قربت رہی۔ وہ مولانا کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اُن کے ہم قدم ہوئے، حصولِ آزادی کے لیے مولانا کے شانہ بشانہ ہم آواز ہو کر انگریز کے غاصبانہ اقتدار کو للکارتے رہے۔ اور دہلی جیل میں مولانا کے ساتھ قید رہے۔ فرماتے:

''مولانا آزاد کے ''الہلال'' نے میری شریانوں میں لہو دوڑایا، میرے ذہن کو جلا بخشی اور سیاسی جدوجہد میں رہنمائی کی۔ ''احرار''، ''الہلال'' کی بازگشت ہی تو ہیں۔''

الہلال میں ''احرارِ اسلام'' کے مستقل عنوان کے تحت ''ترکانِ احرار'' کی سرگرمیاں شائع ہوتیں۔ بعض مسائل میں مولانا کے تفردات پر کسی نے اباجی سے سوال کیا کہ آپ مولانا کی رائے سے متفق ہیں؟ فرمایا:

''میں سیاست میں ابوالکلامؒ کا مقلّد ہوں، فقہ میں نہیں۔ فقہی مسائل میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مقلّد ہوں۔ ہاں! معارف میں کسی کا مقلّد نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کئی لوگوں سے بہتر بات سُجھا سکتے ہیں۔''

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک موت آسا سکوت طاری تھا اور مایوسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور خلیفہ کو گرفتار کر کے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا۔ تنہا مولانا آزاد تھے جو ''الہلال'' و ''البلاغ'' میں اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر خوابِ غفلت سے بیدار کر رہے تھے۔

بیعتِ امام الہند:

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ سیاسی جمود و تعطل کو توڑنے کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک امام کی اقتداء میں منظّم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں۔ پھر امام انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کرے۔ اِنھی دنوں شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ تحریک ریشمی رومال کی پاداش میں مالٹا کی قید سے رہا ہو کر آئے تو مولانا آزاد کی خدمات پر انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''ابوالکلام نے جہاد کا بھولا ہوا سبق یاد کرا دیا ہے۔''

آزادی کے متوالوں نے مولانا آزاد کو ہی امام الہند قرار دے کر اُن کے ہاتھ پر بیعتِ امامت شروع کر دی۔

ابا جی فرماتے:

اِنھی دنوں شاہی مسجد لاہور میں بہت بڑا جلسہ ہوا۔ مشہور کانگریسی اور خلافتی رہنما مولانا عبدالقادر قصوریؒ نے مولانا آزاد سے پہلے ایک تقریر کی اور آخر میں غیر مؤثر انداز میں کہا کہ..... ''لوگو! مولانا آزادؒ امام الہند ہیں، آپ سب ان کی بیعت کریں۔'' ابا جی فرماتے..... میں پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ چند منٹ انتظار کے بعد بھی بیعت کے لیے کوئی آدمی نہ اٹھا۔ مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا۔ ایک ہی جست میں اسٹیج پر پہنچا اور منتظمین سے درخواست کی کہ پانچ منٹ کے لیے مجھے تقریر کی اجازت دیں۔ چنانچہ اس مختصر تقریر میں لوگوں کو سمجھایا کہ یہ ''بیعتِ ارشاد'' نہیں ''بیعتِ امامت'' ہے۔ تم میں سے کوئی اگر کسی پیر سے بیعت ہے تو اس بیعت سے وہ بیعت متاثر نہیں ہوگی۔ پھر مولانا کی بیعت کا اعلان کیا تو ہزاروں افراد نے مولانا کے ہاتھ پر بیعتِ امامت و جہاد کی۔

مولانا آزاد کا خراجِ تحسین:

قومی جدوجہد اور تحریک آزادی میں ابا جی کے مجاہدانہ کردار اور خطابتی خدمات خصوصاً تحریک خلافت میں بے لوث خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

> ''شاہ جی! خطابت آپ کو عطیۂ الٰہی ہے۔ آپ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں۔ قومی جدوجہد میں آپ کی خدمات پر ملک وملت کا ہر گوشہ آپ کا شکر گزار ہے۔ اللہ کے ہاں آپ کا بڑا اجر ہے۔''

مولانا آزاد سے چند یادگار ملاقاتیں:

وزارتی مشن کے دنوں میں ابا جی ایک روز مولانا سے ملاقات کے لیے گئے تو شیخ حسام الدینؒ اور شورش کاشمیریؒ ساتھ تھے۔ میر احمد حسنؒ صاحب کی موٹر میں گئے۔ مولانا' وائسریگل لاج جانے کے لیے کوٹھی کے باہر پریشان کھڑے تھے۔ ان کی موٹر سٹارٹ نہ ہو رہی تھی۔ ابا جی پہنچے تو سلام و مصافحہ کے بعد مولانا نے فرمایا کہ میں آپ کی موٹر لیے جاتا ہوں۔ ابا جی نے کہا حضرت دوش حاضر ہیں۔ فرمایا: ''میرے بھائی! وہ بوجھ تو آپ اٹھائے ہوئے ہیں''۔ کچھ دیر بعد واپس تشریف لے آئے اور گھنٹہ بھر ملاقات رہی۔ چائے بھی پلوائی۔ ''غبارِ خاطر'' چھپ چکی تھی' اس کا ایک نسخہ اپنے دستخط کے ساتھ ہدیہ کیا۔ لکھا تھا: ''برائے صدیقِ عزیز سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری''۔ اسی ملاقات میں ابا جی نے فرمایا مولانا، اللہ آپ کو عمرِ خضر عطاء فرمائے تو فرمانے لگے: ''نہیں میرے بھائی تھوڑی ہو مگر قرینے کی ہو۔'' اس سے پہلے ''تذکرہ'' اور ''ترجمان القرآن'' بھی ابا جی کو ہدیۃً ہی دی تھیں۔ ان پر لکھا تھا برائے ''محبِّ عزیز سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب'' ''غبارِ خاطر'' پر ''صدیق عزیز'' دیکھ کر میں نے کہا ابا جی اب آپ کے مرتبہ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ابا جی مسکرانے لگے۔ یہ تمام کتابیں تقسیم کے وقت امرتسر میں ہی رہ گئیں۔

دِلّی جیل میں مولانا آزاد کی چائے:

دِلّی جیل کا واقعہ ابا جی نے سنایا تھا۔ مولانا آزاد بھی اسی جیل میں تھے اور مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم و مغفور بھی۔ ایک روز موقع پا کر ابا جی اور مولانا احمد سعید صاحب ملاقات کے لیے مولانا کے کمرے میں پہنچے ہی تھے کہ جیلر یا سپرنٹنڈنٹ

راؤنڈ کرتا ہوا ادھر آتا دکھائی دیا۔ مولانا نے فرمایا، میرے بھائی! آپ بیٹھئے میں انہیں ''مصروف'' کرتا ہوں۔ باہر تشریف لے جا کر اس سے گفتگو شروع فرما دی۔ پھر اس نے کیا ادھر آنا تھا' وہیں سے واپس ہو گیا۔ مولانا احمد سعید سنا ہوا ہے بڑے بے دھڑک بزرگ تھے۔ مولانا آزاد سے کہنے لگے۔ لاحول ولاقوۃ آپ کے پاس آنا تو ایسے ہے جیسے کوئی شریف آدمی دن دہاڑے ''اُس بازار'' میں پکڑا جائے۔ بے چارے مولانا یہ ریمارکس پی گئے۔ پھر چائے بنائی اور پوچھا کیسی ہے؟ ابا جی نے تعریف کے ساتھ کہا۔ حضرت ایک کمی رہ گئی۔ ابا جی کہتے اب مولانا سے کوئی یہ کہے کہ آپ کی چائے میں کمی رہ گئی؟ بڑی بڑی غزالی آنکھیں اٹھا کر تعجب اور حیرت سے پوچھا وہ کیا میرے بھائی؟ میں نے کہا دو پتی زعفران بھی ہوتی۔ فرمایا آپ اضافات کی بات کرتے ہیں۔ پھر کسی روز آیئے آپ کو ''مزعفر'' پلاؤں گا۔ چنانچہ ایک روز زعفرانی چائے بھی پلائی۔

مولانا آزاد کی تقریر:

۱۹۵۰ء میں ملتان میں ایک شب میں نے ریڈیو لگایا تو اچانک دِلّی لگ گیا۔ حضرت نظام الدین رحمتہ اللہ علیہ کے عرس کی کارروائی نشر ہو رہی تھی۔ اعلان ہوا کہ مولانا آزاد تقریر فرمائیں گے۔ ان کی آواز کبھی نہ سنی تھی۔ میں بھاگم بھاگ گئی اور بیٹھک کے دروازے پر زور سے دستک دی۔ بھائی جان (مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاریؒ) آئے تو بتایا کہ مولانا آزاد کی تقریر ہونے لگی ہے۔ میرے آتے جاتے تقریر شروع ہو گئی۔ اتنا یاد ہے آیت مبارکہ **وَمِنَ النَّاسِ مَن يَّشْرِيْ نَفْسُهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰه** پڑھی تھی۔ ابا جی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک آہ بھری اور کہا چلو آواز ہی سن لی۔ حضرت مولانا کی تقریر میں خطابیہ جملے کچھ اس انداز کے تھے کہ ''آپ دیکھو گے''، ''آپ سنو گے'' ابا جی فرمانے لگے کہ یہ ہے قلعۂ معلّٰی کی زبان اور اب ابوالکلام کے بعد یہ کون بولے گا؟

ابا جی کے نام مولانا آزاد کے خطوط:

ابا جی کے نام مولانا آزاد کے کئی خطوط آئے اور وہ سب امرتسر میں رہ گئے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں ابا جی کا تمام کتب خانہ ضائع ہو گیا جس کا انھیں شدید قلق تھا۔ اتفاق سے مولانا کے تین خطوط محفوظ رہ گئے۔ ۲۰ر ستمبر ۱۹۴۶ء (سوائے ہوٹل مسوری)، ۱۰ر فروری ۱۹۴۷ء اور ۱۳ر فروری ۱۹۴۷ء۔ (دہلی)

۲۰ر ستمبر ۱۹۴۶ء کا لکھا ہوا خط الیکشن سے پہلے کا ہے۔ اور یقیناً ''ضروری باتیں'' اسی سے متعلق تھیں۔ ابا جی مسوری گئے تھے نہ دِلّی۔ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ نے ماسوائے ابا جی کے باقی حضرات کی رضامندی و علم سے ''ضروری معاملہ'' طے کر لیا تھا۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور شورش کاشمیری مرحومین بھی کہتے تھے' ہم لاعلم تھے۔ (یہ ''احرار یونینسٹ انتخابی مفاہمت'' کا معاملہ تھا) واللہ اعلم بالصواب۔

۱۰ر فروری ۱۹۴۷ء کے خط کا سبب ورود یہ واقعہ بنا کہ ایم۔ اے۔ ایس اینڈ کمپنی حبیب گنج لاہور کے مالک حاجی دین محمد صاحب مرحوم و مغفور، حضرت مولانا احمد علی رحمہ اللہ کے مرید خاص تھے اور ابا جی کا بھی از حد اکرام و احترام کرتے تھے۔ بقول شورش مرحوم' انہیں لوہے کا کوٹہ درکار تھا۔ مجھے یوں یاد ہے انہیں کوئی پرمٹ درکار تھا۔ ان کے شریک کار کوئی اور

صاحب بھی تھے، جن سے ابا جی قطعاً واقف نہ تھے۔ ان صاحب کو لے کر حاجی صاحب دہلی گئے اور حضرت مولانا آزاد سے ملاقات کی کوشش کی۔ اتنے ہنگامی دور میں مولانا کے پاس وقت بھی نہ ہوگا۔ اجمل خاں صاحب (مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری) سے ان حضرات نے ملاقات کا وقت مانگا، انھوں نے عذر کر دیا۔ یہ بیٹھ گئے کہ وقت لے کر جائیں گے۔ اجمل خاں بھی اڑ گئے اور صاف انکار کر دیا۔ مایوس ہو کر یہ حضرات ابا جی کے پاس آئے اور مذکورہ واقعے کا قطعاً کوئی ذکر نہ کیا بلکہ اپنا معاملہ یوں پیش کیا کہ مولانا آپ کی سفارش مان لیں گے، آپ ہمارے ساتھ تشریف لے چلیے۔ اب حاجی صاحب سے صرف سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے تو تعلق نہ تھا۔ وہ سرمایہ دار ایسے تھے کہ ان کے کارخانے میں نمازوں کے اوقات میں کام بالکل بند ہو جاتا اور حاجی صاحب معمولی ملازمین کے ساتھ جس صف میں جگہ مل جاتی کھڑے ہو جاتے اور جس روز حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ تشریف فرما ہوتے، نماز کے فوراً بعد وہ ان کے جوتوں کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے اور حضرت مولانا جب فارغ ہوتے تو وہ جوتے اٹھا کر ان کے آگے رکھ دیتے۔ ان وجوہ سے ابا جی ان کی قدر کرتے تھے۔ ان کے اصرار پر ابا جی مان تو گئے مگر کہا کہ شورش کو ساتھ لے لیتے ہیں۔ حاجی صاحب کو اتنی عجلت تھی کہ اس زمانے میں انھوں نے دو سیٹیں ہوائی جہاز کی ریزرو کرائیں۔ ایک اپنے لیے اور ایک ابا جی کے لیے۔ لیکن ابا جی نے شورش صاحب اور حاجی صاحب سے فرمایا کہ آپ لوگ ہوائی جہاز پر جائیں، میں گاڑی میں آؤں گا۔ وہ اپنے کارکنوں سے یہی سلوک کرتے تھے۔ شورش صاحب کی اللہ بال بال مغفرت فرمائے۔ جاتے ہوئے روزنامہ ''آزاد'' میں آٹھ کالمی سرخی لگا گئے کہ:

''حضرت امیر شریعت، مولانا آزاد سے اہم مذاکرات کے لیے دہلی روانہ''

ابا جی، شورش صاحب کے بعد ریل گاڑی میں دہلی پہنچے۔ وہاں سب کا قیام میر احمد حسن صاحب شملوی کے ہاں ہوتا یا دفتر احرار میں۔ صبح جب مولانا کے ہاں پہنچے جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے، انہیں کسی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لیے جانا تھا اور بروقت تیار نہ ہو پائے تھے۔ جب یہ حضرات پہنچے تو اجمل خاں صاحب نے جا کر بتلایا کہ وہی لوگ اب شاہ صاحب کو لے کر آئے ہیں۔ ابا جی فرماتے کہ جب مولانا باہر آئے تو منہ پونچھتے ہوئے آ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی آ رہے ہیں۔ میں نے تو ماتھا دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ غصہ چڑھا ہوا ہے۔ آج خیر نہیں۔ سلام و مصافحہ کے بعد غرضِ آمد دریافت فرمائی جو ابا جی نے حاجی صاحب کی روایت سے بیان کر دی۔ مولانا کا پارہ چڑھ گیا۔ انھوں نے کہا میرے بھائی، یہ لوگ پہلے بھی آئے اور دھرنا دے کر بیٹھ گئے کہ ملے بغیر نہیں جائیں گے۔ اس کے بعد اس سلسلے میں کچھ بھی کرنے سے انکار فرما دیا اور موٹر میں بیٹھ کر دفتر چلے گئے۔ ابا جی کو بہت افسوس تھا کہ حاجی صاحب نے اخفاء کر کے بات بگاڑ دی۔ دوسرے مولانا نے حد سے زیادہ ہی بے نیازی کا مظاہرہ فرمایا اور یہی ملاقات زندگی کی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ پھر ابا جی نہ کبھی دہلی گئے نہ ملے۔ حاجی صاحب سے ابا جی نے گلہ کیا کہ اگر تم نے مجھے لاہور بتا دیا ہوتا کہ تم لوگ پہلے کوشش کر چکے ہو تو میں کبھی ساتھ نہ آتا۔ بعد میں مولانا کو احساس ہوا تو ۱۰ اور ۱۳ فروری کو یہ مکتوب لکھے۔

ایک خط میں نے امرتسر میں ابا جی کے نام دیکھا تھا۔ عید کی امامت کا مسئلہ تھا۔ کلکتہ کے کچھ لوگ ان سے

درخواست کرتے تھے ۔انھوں نے انکار فرمایا۔ غالباً دو آدمی امرتسر آئے اور ابا جی سے کہا کہ آپ ہمارے ساتھ چلیے اور سفارش کیجیے۔ابا جی نے پوچھا مولانا کے علم میں ہے کہ آپ لوگ مجھے لینے آئے ہیں؟ انھوں نے انکار کیا، ابا جی نہ گئے ۔لیکن مولانا کو معلوم ہو گیا کہ کوئی صاحب ابا جی کو لینے گئے تھے۔ مجھے خط کا اتنا فقرہ یاد ہے:

''یوں آپ کلکتہ آئیں تو مجھ سے زیادہ خوشی کس کو ہوگی؟ لیکن اس مسئلہ کے لیے نہ آئیں۔''

اور ابا جی تو پہلے ہی انکار کر چکے تھے۔

مولانا آزاد کے خطوط:

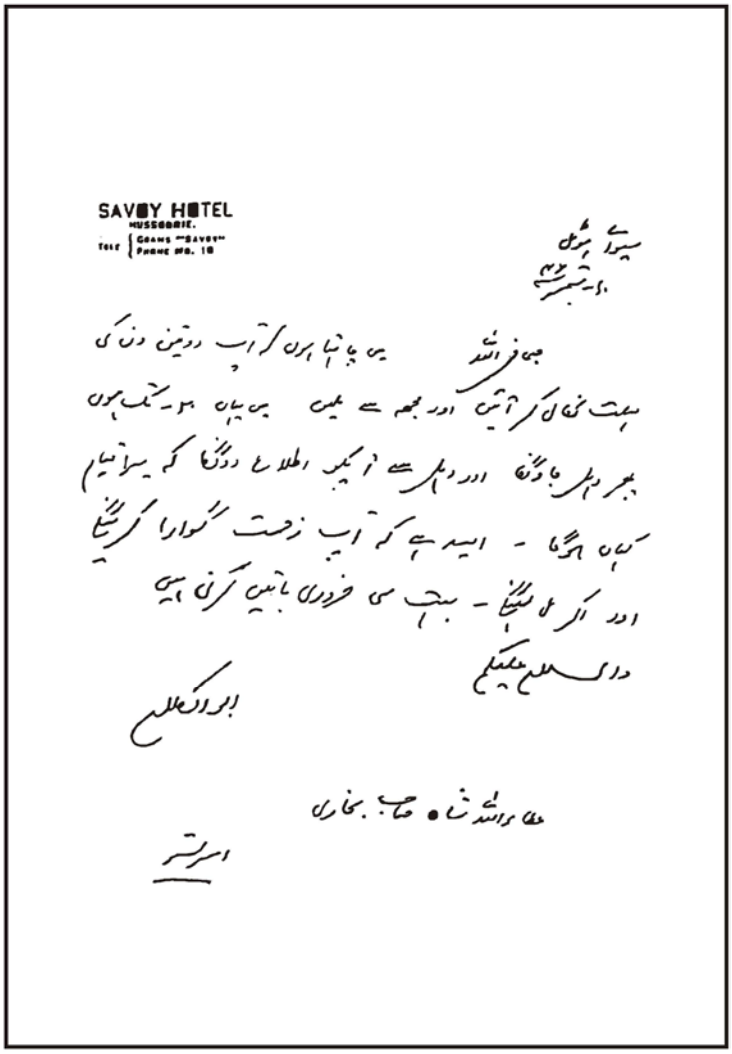

SAVOY HOTEL
MUSSOORIE.
TELE { GRAMS "SAVOY" PHONE NO. 10

سیوائے ہوٹل
۱۰ ستمبر [illegible]

حبی فی اللہ میں چاہتا ہوں کہ آپ دو تین دن کی مہلت نکال کر آئیں اور مجھ سے ملیں میں یہاں ۲۰ ستمبر تک ہوں پھر دہلی جاؤں گا اور دہلی سے آپ کو ایک اطلاع دوں گا کہ میرا قیام کہاں ہوگا۔ امید ہے کہ آپ زحمت گوارا کریں گے اور آکر ملیں گے۔ بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں

والسلام علیکم
ابوالکلام

عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری
امرتسر

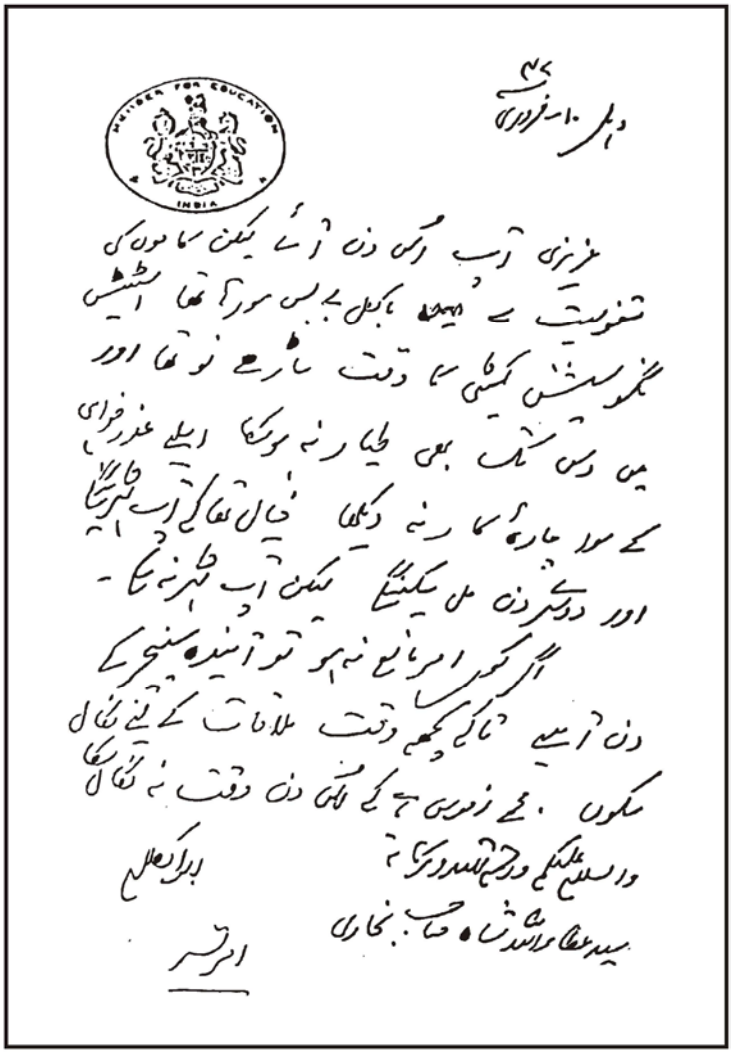

دہلی ۱۰۔فروری ۴۷ء

عزیزی! آپ اُس دن آئے لیکن میں کاموں کی
مشغولیت سے پہلے بالکل بے بس ہو رہا تھا۔ ایک سٹینڈ
نگ کمیٹی کا وقت ساڑھے نو تھا اور
میں دس منٹ بھی لیا رہنا ہو سکا۔ اس لیے عذر خواہی
کے سوا چارہ کار نہ دیکھا۔ خیال تھا کہ آپ ٹھہریں گے
اور دوسرے دن مل سکیں گے لیکن آپ ٹھہر نہ سکے۔
اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو آئندہ سنیچر کے
دن آئیے تاکہ کچھ وقت ملاقات کے لیے نکال
سکوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اُس دن وقت نہ نکال سکا

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
ابوالکلام

سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری
امرتسر

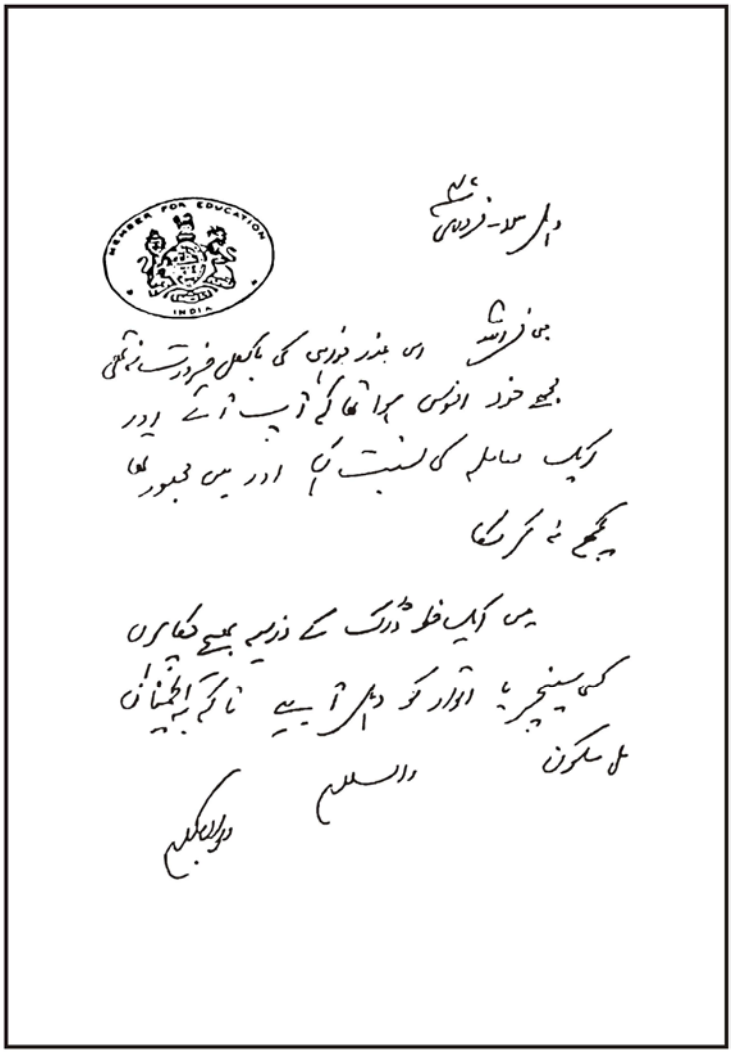

ابوالکلام آزادؒ کی فکری زندگی

عالم خوندمیری

انیسویں اور بیسویں صدی کو ہندوستانی مسلمانوں کے دور انحطاط سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ تعبیر ایک حد تک صحیح ہے، یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی مسلمان سیاسی اقتدار سے محروم ہو رہے تھے اور ان کا سیاسی اور معاشرتی مؤقف تیزی کے ساتھ انحطاط کی جانب مائل ہو رہا تھا۔ لیکن یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ اسلام نے ہمیشہ دورِ انحطاط میں کسی نہ کسی ایسے عظیم مفکر کو جنم دیا، جس نے فکر و نظر کی راہوں میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں جب مغربی ایشیاء اور شمالی افریقہ کی سلطنتیں انتشار اور تباہی کی قریباً آخری منزل پر دکھائی دے رہی تھیں۔ اسلامی دنیا میں عہدِ وسطیٰ کے سب سے بڑے مفکر اور تاریخ کے فلسفی ابن خلدون کا ظہور ہوا، جو زندگی بھر حوادث اور فتنوں کا مقابلہ کرتا رہا، لیکن جس نے ان حادثوں اور فتنوں سے انسانی حیات اور تاریخ کے بارے میں ایک نیا شعور اور ایک نیا نقطہ نظر حاصل کیا اور صرف عربوں کے نہیں بلکہ دنیا کے مجموعی علم میں ایک عظیم الشان اضافہ کا باعث ہوا۔ ہندوستان میں، جس زمانہ میں اسلام کا نشو و نما ہوا، وہ دور اسلام کی زندگی کا یقیناً تابناک دور نہیں تھا' اس کا فکری اور عقائدی نظام ترقی، نشو و نما، تبدیلی و تنزل و انحطاط کی قریباً تمام منزلیں طے کر چکا تھا۔ تباہی اور انتشار کی انتہا یہ تھی کہ اس دور کے حساس اہل نظر اپنے دور کو دنیا کا آخری عہد بھی تصور کرنے لگے تھے۔ پندرہویں صدی میں جب شمالی ہندوستان میں سیاسی نراج اور انتشار کی کیفیت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ بظاہر ''جسدِ مردہ'' میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے، حیات بخش تحریکوں نے جنم لینا شروع کیا اور ہندوستان میں اسلام صرف ایک سیاسی قوت نہیں رہا بلکہ عالمگیر اسلامی تہذیب اور اسلامی علوم و فنون کے خزانے کو بھی مالا مال کیا۔ اسی طرح اورنگ زیب کے بعد جب پھر ایک بار مسلمان سیاسی انحطاط کا شکار ہونے لگے اور ہر طرف مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھانے لگے تو ایک دم سے ایک نئے ذہنی اور فکری انقلاب کے آثار بھی نظر آنے لگے، اسی دور زوال میں دہلی کے شاہ ولی اللہؒ نے بڑے زور و شور کے ساتھ اسلام کو زندگی کے نئے فکری، سماجی، سیاسی اور معاشی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہؒ کی تحریک اور ان کے نقطہ نظر نے ہندوستان کی اسلامی دنیا میں ایک بڑا انقلاب برپا کر دیا، جونپور کی مہدوی تحریک کے بعد شاہ ولی اللہؒ کی تحریک ''اسلامی ہند'' کی سب سے بڑی تحریک تھی جس نے نہ صرف شریعت اور طریقت کے فرق کو کم کرنے کی پرزور کوشش کی بلکہ اسلام کے بنیادی امور کے بارے میں ایک نیا اور حیات بخش نقطہ نظر فراہم کیا۔ شاہ ولی اللہؒ کی جلائی ہوئی شمع سے آنے والے دنوں میں مختلف شمعیں روشن ہوتی رہیں۔ سرسید احمد خان اور ان کے اصلاح پسند رفقاء نے بھی اس شمع سے روشنی حاصل کی۔ شاہ ولی اللہؒ کی تحریک میں کئی امکانات مضمر تھے، ایک امکان تو وہ تھا جس کی تکمیل سرسید احمد خاں نے کی اور وہ یہ تھا کہ اسلام کی حقانیت کو نئی اور طاقتور دلیلوں کے ساتھ پیش کیا جائے، سرسید احمد خاں نے اس امکان کو اس کے منطقی حد تک پہنچانے کی کوشش کی اور بدقسمتی سے یہ منطقی حد اکثر صورتوں میں ''اعتذار'' میں بدل گئی۔ سرسید دین کی حقانیت اور اسلا

م کی فطرت کو ثابت کرنے کے جوش میں اس منزل تک پہنچ گئے جہاں اسلام انیسویں صدی کی سائنس اور حکمت کی ایک طفلانہ تعبیر نظر آنے لگا۔ شاید ان کا نصب العین جدید علوم اور اسلام میں تطابق تھا' اس کے خلاف جو ردِّ عمل ابھرا' اس کے ایک نمائندے شبلی نعمانی (وفات ۱۹۱۴ء) تھے' جنھوں نے دوسرے طریقے سے روایت کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے، ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی۔ سرسید اور شبلی کا اختلاف نقطۂ نظر سے زیادہ طریقۂ عمل کا اور مقصد سے زیادہ ذریعے کا اختلاف تھا۔ سرسید احمد خان اور شبلی نے مرض کی پہچان صحیح کی، اس بحران کو محسوس کیا' جس میں انیسویں صدی کے آخر میں اسلام گھر گیا تھا' لیکن ان کے بتائے ہوئے' علاج تک رسائی صرف ان لوگوں کی ہوسکتی تھی جو علم الکلام کی موشگافیوں کی تاب نہ لاسکتے تھے۔ شبلی کو اپنے مجوزہ علاج کی ناتمامی کا جب احساس ہوا تو انھوں نے عمر کے آخری حصے میں اسلام کے منبع یا Source کی جانب توجہ کی اور شاید سیرت النبی کی تصنیف، ان کے اسی احساس کا ایک اظہار بنی۔ ہندوستان میں اسلام کو پھر سے ایک قوتِ محرکہ بنانے کے لیے ایک زیادہ پرجوش موثر کی ضرورت تھی جو صرف منطقی فکر کی پابند نہ ہو بلکہ راست انسانی وجدان کو متحرک کرسکے اور اس سرچشمہ سے قریب کرسکے' جس سے بعد کے ادوار میں ''تمدن، تصوف، شریعت اور کلام'' کی نہریں نکلتی ہیں۔ شاہ ولی اللہی تحریک کے اس دوسرے امکان کو ان کے متبعین اور پیروؤں نے قریباً تشنہ چھوڑ دیا تھا۔ اگر ان کے اولوالعزم صاحبزادے ''تحفۂ اثناعشریہ'' کی تصنیف میں مشغول ہوگئے تو دوسرے بلند ہمت جانشین یک طرفہ جوش وخروش کا اس طرح شکار ہوگئے کہ اس تحریک سے مغربی اثر سے فیض یاب ہونے والے ذہن گھبرا سے گئے۔ شاہ ولی اللہؒ کی اصلی تحریک کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ''دین'' کو اس کی اصلی ابتدائی صورت میں پیش کیا جائے اور ''اسرار دین'' کو منکشف کیا جائے، لیکن (علم) کلام کی مدد سے نہیں بلکہ کتاب اور سنت کی روشنی میں۔ اگر صحیح معنوں میں اس عظیم امکان کی ہندوستان میں کسی ایک شخص نے تکمیل کی تو وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ (وفات ۱۹۵۸ء) ہیں۔ مولانا آزادؒ نے صرف اس امکان کی تکمیل ہی نہیں کی بلکہ اپنی مجتہدانہ فکر اور محیر العقول ذہانت کے ذریعے' جس کی ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بہت کم مثالیں مل سکتی ہیں، اسلام کی بنیادی انسانیت دوستی کو جس پر صدیوں کے تعصب اور تنگ نظری کی گرد جمی ہوئی تھی، اس طرح اجاگر کیا کہ اسلامی تاریخ میں اسلام کی عظمت اور اس کی اہمیت مسلّم ہوگئی۔ ان کے اپنے ذہنی اور ان کے فکری ارتقا میں ہمیں اسلام کی فکری تاریخ کے تمام منازل نمایاں نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کی پوری فکری زندگی ''تفکر'' اور ''تدبر'' کی بہترین مثال فراہم کرتی ہے۔ جو قرآن کی رُو سے ''معرفت حق'' کی سب سے یقینی راہ ہے۔ (۱) اگر ایک لحاظ سے وہ ''قدیم اسلام'' کا ایک بہترین نمونہ ہیں جن کی تعلیم وتربیت میں قدامت کی بہترین اور اعلیٰ ترین اور ساتھ ہی انتہائی محدود روایتیں شامل تھیں' تو دوسری طرف جدید مسلم فکری رہنماؤں میں اقبال (وفات ۱۹۳۸ء) کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا مفکر اور عالم مل سکے جو جدید علم وحکمت اور جدید نقطۂ نظر سے اتنی گہری واقفیت رکھتا ہو۔ ''غبارِ خاطر'' کے بعض خطوط اور ''ترجمان القرآن'' کے بعض مقامات کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ قدیم طرز تعلیم کا یہ سب سے ممتاز نمائندہ جدید فکری رجحانات اور میلانات کا اتنا گہرا علم کیسے حاصل کرسکا، وہ صرف جدید مغربی رجحانات ہی سے واقف نہیں بلکہ قدیم ہندوی فلسفے اور مذاہب کے مطالعہ سے بھی ان کی نظر محروم نہ رہی' ان کی نظر میں مشرق ومغرب کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خود ان کے الفاظ میں ''علم ونظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں لیکن میرے لیے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثے میں ملا' اور جو کچھ جدید ہے' اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکال لیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں

میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں۔'' (۲)

جدید اور قدیم کا یہ امتزاج ایک بڑی ذہنی کشمکش کا ثمر ہے۔ ''غبارِ خاطر'' کے دوسرے خط میں تفصیل سے اس ذہنی کشمکش کی تصویر کھینچی ہے۔ ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد میں ''اصول ترجمہ وتفسیر'' کے باب میں اختتام پر مختصراً اس ذہنی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیئے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دارالشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری لب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا۔'' (۳) شک، انکار اور اضطراب کے ان منازل کو طے کرنے کی وجہ سے مولانا آزادؒ کی فکر میں جو وسعت، جو گہرائی، جو آفاقیت اور جو انسانیت نظر آتی ہے، اس کی نظیر مشکل ہی سے کسی دوسرے مسلم مفکر اور عالم میں مل سکتی ہے۔ اعلیٰ ترین فکری امکان اور ''شعریت'' کا امتزاج بہت کم نظر آتا ہے۔ مولانا آزادؒ عرفِ عام میں شاعر نہیں تھے۔ لیکن ان کے مزاج میں شعریت کا عنصر اپنے کمال کو پہنچا ہوا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ اس تنگ نظری سے بلند رہے اور شاید کبھی اس کا شکار نہ ہوئے جو عام طور پر ان لوگوں کے حصے میں آئی، جن کا مقصد بھی ان کی طرح اسلام کو اور قرآن کو اس کی حقیقی شکل و نوعیت میں اور صحابہ وسلف کے اعلیٰ نقطۂ نظر کی روشنی میں پیش کرنا تھا۔ مزاج کی اس شعریت کا نتیجہ ہے کہ جہاں ان میں ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، احمد بن حنبلؒ کا جلال نظر آتا ہے، وہیں رومی وسنائی کے سوز کے آثار بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہی شعریت کا اثر ہے کہ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی جانب دعوت دینے والے ابوالکلامؒ سرمد اور اورنگ زیب کی کشمکش میں سرمد کی جانب دکھائی دیتے ہیں اور ان کی ہمدردیاں اور اورنگ زیب سے زیادہ دارا شکوہ (۴) کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے مزاج کی.....یہی ''شعریت'' ہے جس نے خدا کی رحمت اور ربوبیت کی جانب ان کے وجدان کی رہنمائی کی اور انھوں نے قرآن کا ایک نئے رنگ اور ایک نئے اسلوب سے مطالعہ کیا۔ ان کی تعلیم وتربیت ''کلاسیکی'' نوعیت کی رہی، لیکن ان کے مزاج اور ان کی افتاد میں وسیع معنی میں ''رومانی اثرات'' غالب نظر آتے ہیں۔ پروفیسر گب (Gibb) کا خیال ہے کہ عرب ذہن انتہائی تخیلی اور رومانی ہے۔ مولانا آزاد کے ذہن میں اس ''تخیلیت اور رومانیت'' کی پوری علامت نظر آتی ہے۔ اسی تخیلیت اور رومانیت کے ذریعہ انھوں نے قرآن کی اصلی روح کا جس میں فلسفہ وحکمت کی استدلالی منطق سے زیادہ وجدانی استقرائیت پر زور دیا گیا ہے۔ سمجھنے میں کامیابی حاصل کی۔ مذہب کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر وجدانی ہے۔ وہ ایسے مذہب سے راضی نہیں جو ''عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے اور دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے۔'' ان کے نزدیک ''زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔'' ''ہم صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کرسکتے جنھیں ثابت کرسکتے ہیں اور اس لیے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنھیں ثابت نہیں کرسکتے، لیکن مان لینا پڑتا ہے۔''

مولانا آزادؒ کی مذہبی تحریروں میں خواہ وہ ''تذکرہ'' ہو یا ''ترجمان القرآن'' ''الہلال'' کے مضامین ہوں یا ''غبارِ خاطر'' کے وہ مقامات، جہاں وہ مذہب پر گفتگو کرتے ہیں۔ ان کا بنیادی مخالف کلاسیکی (Anti Classical) رجحان نمایاں نظر آتا ہے، جسے ایک لحاظ سے ''عرب ذہن'' کا ایک خاصا کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کی رومانیت محض ایک طوفان اور سرجوش

نہیں۔ یہ ایک بے ترتیب جذبے کا اظہار نہیں بلکہ اس کے خمیر میں تخیل کی بلند ترین پرواز اور حیات بخش عقلیت کا نازک ترین عنصر شامل نظر آتا ہے۔ تخیل، وجدان اور عقلیت کا یہی امتزاج مولانا آزادؒ کو دوسرے مسلم مفکرین اور علماء سے ممتاز کرتا ہے۔ شاید یہی نادر مزاج ان کی ''انفرادیت'' ہے جس نے اسلام کو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے مطابق کرنے میں اس طرح کامیابی حاصل کی کہ ایک طرف اسلام دورِ حاضر کا سیاسی اور سائنسی منشور نہیں بنا تو دوسری طرف اس بات کا اندیشہ نہ رہا کہ ہر نئی تحقیق، سائنس اور حکمت کے ہر نئے انکشاف اور سیاست و معیشت کے ہر نئے انقلاب کے ساتھ خواہ یہ تحقیقیں، یہ نئے نئے انکشافات اور نئے نئے انقلابات باہم دگر کتنے ہی متضاد کیوں نہ ہوں' اسلام اور قرآن کی نئی تعبیر کرنا پڑے گی۔ انھوں نے اپنی ذہنی اور فکری زندگی کے آغاز ہی میں اپنا یہ نصب العین بنالیا تھا کہ اسلام کو اس کی اصلی اور بنیادی صورت میں پیش کیا جائے، ان کی پہلی مستقل تصنیف ''تذکرہ'' ان کے ابتدائی دور کے ذہن کی، جوان کے ذہن کا تشکیلی دور تھا، بہترین ترجمان ہے۔ ''تذکرہ'' کے مصنف ابوالکلام آزادؒ بھی تقلید اور روشِ عام پر چلنے کے مخالف ہیں، لیکن ان کا ذہن ابھی اسلام اور قرآن کی ''انسانیت نواز'' (Humanitic) تعلیمات تک پوری طرح نہیں پہنچا تھا۔ ان پر ایک مجاہدانہ رنگ طاری نظر آتا ہے اور اسی لیے جب وہ ان علماء و مذہبی قائدین کا ذکر کرتے ہیں، جنھوں نے اقتدار کے خلاف مزاحمت کی تو ان کے قلم سے شعلے نکلنے لگتے ہیں۔ اگر وہ ابتدائی مہدوی تحریک کے رطب اللسان ہیں تو امام ابن تیمیہؒ اور احمد بن حنبلؒ کے بھی مدح خواں اور امام حسینؓ اور امام علی رضاؒ کا بھی اسی ادب و احترام سے ذکر کرتے ہیں۔ مصنف صرف سیاسی میدان ہی میں مجاہد نہیں ہیں بلکہ مذہبی میدان میں بھی مجاہدانہ انداز غالب ہے۔ پچھلے دور سے اور قرونِ اولیٰ سے ان کی محبت اور عقیدت پر ایک رومانی انداز چھایا ہوا نظر آتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ ان کی شعریت اور علمیت، رومانیت اور عقلیت میں ایک امتزاج اور توازن پیدا ہو رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ ان کی سیاسی زندگی اور اس کے وسیع تجربات نے بھی انگریزی اور فرانسیسی ادب اور فلسفے کے مطالعے کے ساتھ ساتھ ان کی نئی ذہنی تشکیل میں مدد دی ہو۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ انسانی ذہن خلا میں ترقی نہیں کرتے تو پھر زندگی کا ہر تجربہ ذہن کی تشکیل میں ایک بڑا معاون بن جاتا ہے۔ ان کے فکری ارتقاء پر ان کی سیاسی زندگی کے اثرات کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ بات ماننا ضروری ہے کہ انھوں نے حتی الامکان شعوری حیثیت سے اپنی فکر کو ہر آن بدلنے والی سیاست اور اس سیاست سے پیدا ہونے والے مطالبات سے محفوظ رکھا۔ مغربی سامراج کے خلاف ان کے جذبات اپنے ہم عصر مسلم مفکرین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید تھے۔ کیوں کہ وہ خود اس جدوجہد کے صرف ایک رکن نہیں بلکہ عظیم قائد تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے مغربی سائنس، مغربی فلسفے، مغرب کے سیاسی اور معاشی نظریات کے بارے میں ایک طرفہ تنگ نظری کا نہ صرف یہ کہ مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اس صدی کے ہندوستانی فکری اور سیاسی رہنماؤں میں ''جدیدیت'' (Modernism) کے آزاد جیسے علمبردار بہت کم نظر آئیں گے۔ قدیم اور جدید کے بہترین امتزاج کے ساتھ فکری دنیا میں ''جدیدیت'' کی ترجمانی کی ایک دوسری مثال شاید صرف رادھا کرشنن ہیں۔ یہ ایک تناقض محال یا (Paradox) نظر آتا ہے کہ ایک طرف مولانا آزاد قرآن کی تفسیر کے لیے صحابہ و سلف سے نیچے اترنے کے لیے تیار نہیں تو دوسری طرف وہ ''جدیدیت'' کے علمبردار بھی ہیں۔ مولانا آزاد کی تصانیف اور خصوصاً ''ترجمان القرآن'' کا مطالعہ اس (Paradox) کو حل کرتا ہے۔ انھوں نے ایک لحاظ سے سب سے پہلی بار اسلام کی حقیقی روح کو قرآن کے ذریعے سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی۔

اسلام کی یہ حقیقی روح اقبال کے الفاظ میں ''تمدن، تصوف، شریعت اور کلام'' کی روایتوں میں گم ہوگئی تھی۔ ایسا واقعہ صرف اسلام ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا بلکہ قریباً ہر مذہب کو تاریخ اور تمدن کی طاقتور قوتوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کے نزدیک قرآن کی رو سے ہر تاریخی مذہب کی ایسی حقیقی روح کا جس پر رفتہ رفتہ ''تمدن، تصوف، شریعہ اور کلام'' کے پردے پڑ جاتے ہیں اور جس کی اصلی حقیقت ''خرافات'' میں کھو جاتی ہے' نام ''الاسلام'' یا ''الدین'' ہے۔ اسی کا نام دینِ فطرت ہے اور یہی تمام مذاہب کی اصلی روح اور ان کا سرچشمہ ہے۔ اسلام اسی ''الدین'' کے احیاء کا نام ہے۔ ''دین الٰہی کی اصل نوعِ انسانی کی اخوت و وحدت ہے' نہ کہ تفرقہ و منافرت۔ خدا کے جتنے رسول بھی دنیا میں آئے، سب نے یہی تعلیم دی تھی کہ تم سب اصلاً ایک ہی امت ہو اور ایک ہی گروہ ہو، تم سب کا پروردگار ایک ہی پروردگار ہے۔ پس چاہیے کہ سب اسی ایک پروردگار کی بندگی کریں اور ایک گھرانے کے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ اگرچہ ہر مذہب کے داعی نے اسی راہ کی تعلیم دی، لیکن ہر مذہب کے پیروؤں نے اس سے انحراف کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل نے اپنے اپنے جتھے الگ الگ بنا لیے اور ہر جتھا اپنے طور طریقے میں مگن ہوگیا۔'' مولانا کے مطالعہ قرآن کا ماحصل یہ ہے کہ ''قرآن نے پچھلے رسولوں اور مذہب کے بانیوں میں سے جن جن رہنماؤں کے مواعظ نقل کیے ہیں' ان سب میں بھی اصل اصول یہی حقیقت ہے اور عموماً اکثر مواعظ کا خاتمہ دین کی وحدت اور انسان کی عالمگیر اخوت کی تعلیم ہی پر ہوتا ہے۔''(۵)

مولانا آزاد کے نزدیک قرآن نے اس سلسلہ میں جس چیز پر زور دیا ہے' ان میں تین باتیں سب سے نمایاں ہیں:

(۱) انسان کی نجات و سعادت کا دارومدار اعتقاد و عمل پر ہے' نہ کہ کسی خاص گروہ بندی پر۔

(۲) نوع انسانی کے لیے دینِ الٰہی ایک ہی ہے اور یکساں طور پر سب کو اسی کی تعلیم دی گئی ہے۔ پس یہ جو پیروانِ مذاہب نے دین کی وحدت اور عالمگیر حقیقت ضائع کر کے بہت سے متخالف اور متخاصم جتھے بنا لیے ہیں' یہ صریح گمراہی ہے۔

(۳) اصل دین توحید ہے یعنی ایک پروردگارِ عالم کی براہِ راست پرستش کرنی اور تمام بانیانِ مذاہب نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ اس کے خلاف جس قدر عقائد اور اعمال اختیار کر لیے گئے ہیں' اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔'' (۶)

مذاہب کی اندرونی وحدت اسلامی فکر کی تاریخ میں بالکلیہ نیا انکشاف نہیں ہے۔ متاخرین میں شاہ ولی اللہ نے بھی ''حجتہ اللہ البالغہ'' میں اس امر کی جانب اشارے کیے ہیں' لیکن جس شرح و بسط کے ساتھ اور استدلال کی جس قوت کے ساتھ مولانا آزادؒ نے ''ترجمان القرآن'' میں اس اصول کو پیش کیا ہے' اس کی نظیر اسلامی لٹریچر میں نہیں ملتی۔ ''وحدتِ ادیان'' مولانا آزادؒ کا مرکزی خیال ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمام مذاہب جیسے کہ وہ اس وقت موجود ہیں' سچے ہیں یا یہ کہ ''ہر مذہب سچائی ہے''۔ بلکہ یہ تمام مذاہب سچے ہیں کیونکہ اصل دین ایک ہی ہے اور سب کو دیا گیا ہے۔ لیکن تمام پیروانِ مذاہب سچائی سے منحرف ہوگئے ہیں۔ انھوں نے دین کی حقیقت اور وحدت ضائع کر دی ہے اور اپنی گمراہیوں کی ٹولیاں بنالی ہیں۔''

عرفِ عام کا اسلام بھی کوئی استثنائی صورت نہیں ہے۔ جس طرح دوسرے مذاہب کے پیرو گمراہ ہوگئے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی جن کی نظروں سے ''الدین'' اور ''الاسلام'' اوجھل ہوگیا ہے۔ حقیقی دین سے اور اس کی عالمگیر روشنی سے محروم ہوگئے ہیں۔ ''تفریق بین الرسُل'' کے خلاف..... قرآن کی غیر مشروط تاکید سے مولانا یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ کسی رسول یا کسی بانیٔ مذہب کا انکار تمام رسولوں کے انکار کے مترادف ہے۔ یہی وہ نازک نکتہ ہے جس پر اصرار کرتے ہوئے' مولانا نے مسلمانوں

کے ''عقیدۂ رسالت'' کا ایک نئی روشنی میں مطالعہ کیا۔ ''ترجمان القرآن'' کے قدامت پسند نقادوں نے ''وحدتِ ادیان'' کے تصور پر جب ہنگامہ بپا کیا تو شاید ان کی نظر اس نازک نکتہ پر نہیں پڑی، جس پر مولانا نے ''ترجمان القرآن'' میں بار بار زور دیا ہے۔ یہاں مولانا کا تصور اور مسلمانوں کا قدیم دینیاتی تصور ایک اعلیٰ سطح پر متحد ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے پچھلے مذاہب کو منسوخ نہیں کیا بلکہ صرف یہ کہا کہ ''الدین'' یا ''الاسلام'' پر ''تحزّب'' (گروہ بندیوں اور جماعت بندیوں) کی وجہ سے جو نقاب پڑ گئے تھے انہیں ہٹایا اور عالمگیر تمدنی وحدت اور توحید کی اساس پر تمام انسانوں کو متحد کر دیا۔ مولانا کا ''وحدتِ ادیان'' کا تصور اس قسم کی عام مذہبی رواداری کا تصور نہیں جو عموماً ذہنی کاہلی کا آفریدہ ہوتا ہے۔ مولانا ''مذہب'' کی اصلی حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں اور تمام دینی انسانوں کو اس ایک بنیاد پر جمع ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ گویا مولانا کی دعوت بنیادی طور پر وہی ہے جو قرآن کی اور پیغمبرِ اسلام کی دعوت تھی۔ لیکن اس مقام پر مولانا کا اس دور کے ''احیاء پرستوں'' سے راستہ الگ ہو جاتا ہے۔ احیاء پرست صرف پیغام کو نہیں بلکہ ان تمام ''اداروں'' کو پھر سے زندہ کرنے کی ''سعیٔ بے حاصل'' کرتا ہے جو ماضی میں کبھی اس پیغام سے وابستہ تھے یا اس پیغام کے خاص وقتی تمدن سماجی اور معاشی اظہار تھے۔ مولانا نے ''ترجمان القرآن'' میں جا بجا ''دین'' اور ''شرع و منہاج'' کے فرق کو واضح کیا ہے۔ شرع و منہاج کو دین کا مترادف قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین مختلف گروہوں میں بٹ گیا۔

''اس نے (قرآن) بتلایا کہ ایک چیز دین ہے۔ ایک شرع و منہاج ہے۔ دین ایک ہی ہے اور ایک ہی طرح پر سب کو دیا گیا ہے۔ البتہ شرع و منہاج میں اختلاف ہوا اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ ہر عہد اور ہر قوم کی حالت یکساں نہ تھی اور ضروری تھا کہ جیسی جس کی حالت ہو ویسے ہی احکام و اعمال بھی اس کے لیے اختیار کیے جائیں۔ پس شرع و منہاج کے اختلاف سے اصل دین مختلف نہیں ہو جا سکتے۔'' (۷)

دین، منہاج اور شرع میں جو اختلاف اور فرق ہے، وہ مولانا کے نزدیک اصل اور فرع کا اختلاف ہے۔ مذاہب میں جس قدر بھی اختلاف شرع و منہاج کے اختلاف کی بنا پر ہوا وہ ''دین کا اختلاف نہیں محض شرع و منہاج کا اختلاف ہے، حقیقت کا نہیں، ظواہر کا ہے، روح کا نہیں ہے، صورت کا ہے۔''

شاہ ولی اللہ نے بھی ''حجتہ اللہ البالغہ'' میں اس فرق و اختلاف کی نوعیت کو واضح کیا تھا، لیکن ان کے ہاں صرف اشارے تھے۔ مولانا نے انھیں اشاروں کو ایک منظّم صورت میں پیش کیا ہے اور اس لحاظ سے مولانا نے شاہ ولی اللہ کے نامکمل مشن کی تکمیل کی۔ منہاج اور شریعت کا سوال ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اسلامی ملکوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ مصر اور شام میں مفتی محمد عبدہٗ کی جدید اسلامی تحریک کے زیر اثر یہ سوالات اور مسائل مسلم دانشوروں کی فکر و نظر پر چھائے رہے۔ مولانا آزادؒ نے بھی صرف نظری سوالوں پر توجہ دی۔ دین اور منہاج کے فرق و اختلاف کو واضح کیا۔ اسی سوال کو اور راست طور پر ''اسلام'' اور ''شریعت کے قوانین'' کے تعلق اور ربط کو ازہر کے ایک عالم علی عبدالرازق نے بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کیا (اتفاق) کی بات یہ ہے کہ مولانا آزاد اور ازہر کے اس عالم نے ایک ہی سال یعنی ۱۸۸۸ء میں جنم لیا) اور کہاں تک بدلتے ہوئے حالات میں نئے قوانین کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اپنی کتاب ''الاسلام و اصول الحکم'' (۸) میں مفتی عبدہٗ کے اس شاگرد علی عبدالرزاق نے اپنے اس انقلاب آفرین خیال کو پیش کیا کہ پیغمبرِ اسلام کا اصلی مشن تمام نوعِ انسانی کا روحانی اتحاد تھا اور چونکہ اسلام کا روحانی مشن عالمگیر نوعیت کا حامل تھا، اس لیے قوانین شریعت کا اطلاق بڑی حد تک اضافی نوعیت رکھتا ہے۔ یہ

استدلال اور نقطۂ نظر بحث طلب ہے اور یہاں مقصود یہ نہیں ہے کہ اس نقطۂ نظر کی تائید یا تردید کی جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جس مسئلے کو مولانا آزاد نے ''ترجمان القرآن'' میں پیش کیا ہے' وہ اسلامی دنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے جو..... بڑی حد تک ان مسلمانوں کے لیے ''موت و زیست'' کا سوال ہے۔ اقبال نے بھی اپنے لیکچرز ''اسلامی فکر کی تشکیل جدید'' میں اس سوال کو ایک بڑا اہم سوال قرار دیا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال بھی اپنے لیکچرز میں مولانا آزاد سے بہت زیادہ دور نہیں ہیں۔ بدقسمتی سے ان سوالات پر ہندوستانی مسلمانوں نے وسعتِ نظر اور روشن دماغی کے ساتھ غور و فکر نہیں کیا جن کے وہ مستحق ہیں۔ ابھی تک ہندوستانی مسلمانوں پر قدیم دینیاتی طرزِ فکر اس حد تک طاری ہے کہ وہ ان نہایت اہم سوالات پر ابھی تک ''کفر و ایمان'' کی اصطلاحات کے تنگ دائرہ سے باہر نکل کر غور کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے۔

الدین، الاسلام، منہاج اور شرع کے امور پر ایک نیا اور حیات بخش نقطۂ نظر عطا کرنے کے علاوہ مولانا نے ''ترجمان القرآن'' میں ایسے بہت سے سوالات پر روشنی ڈالی ہے جو اسلام کی فکری تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل رہے ہیں اور جو ایک عرصہ تک اسلامی دنیا میں گرمیٔ محفل کے اسباب بہم پہنچاتے رہے۔ ان دیرینہ اور ایک لحاظ سے قریباً لاینحل سوالات کو' جنہوں نے صدیوں تک اسلامی ذہن کو الجھائے رکھا، حل کرنے کی کوشش میں مولانا آزاد اپنے لیے ایک نیا راستہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے خدا کی صفاتِ ربوبیت، رحمت اور عدالت کی تشریح کرتے ہوئے' ایسے عجیب نکات پیدا کیے ہیں کہ اُن کی حیرت انگیز ذہانت اور ان کی بے مثال قرآن فہمی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ خدا کی غیریت اور ماورائیت (Transcendence) اور اس کا محیطِ کل ہونا اور کائنات و خلقت میں جاری و ساری رہنا (Immanence) یہ دو متضاد رجحانات ہر مذہب کے اندرونی ''تناؤ'' کا باعث رہے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس بنیاد پر مختلف مذاہب میں اختلافات رہے بلکہ ہر مذہب میں یہ رجحانات باہمی ذہنی اور روحانی کشاکش کا باعث بنے رہے۔ دینیاتی یا (Theological) نقطۂ نظر نے اگر ماورائیت پر زور دیا تو تصوف نے دوسرے متضاد نقطۂ نظر کو اپنا رہنما بنایا۔ مولانا آزاد نے قرآن کی روشنی میں اس اہم مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ رحمت اور ربوبیت کے تصورات سے انھوں نے اس تضاد کو حل کیا ہے۔ قرآن میں جہاں جا بجا ایسی آیتیں نظر آتی ہیں جن میں خدا کی ماورائیت پر زور ہے تو دوسری طرف ایسی آیات کی بھی کمی نہیں جن سے مدد لے کر صوفیا نے کائنات میں خدا کے جاری و ساری وجود اور آگے بڑھ کر ''وحدتِ وجود'' کے تصور کو آگے بڑھایا جیسا کہ اس سے پہلے اسی مضمون میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مولانا نے اپنے دوسرے ان ہم عصروں کا جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و سلف کے طریق کو زندہ کرنا چاہتے تھے۔ مخالف تصوف نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا۔ یہ مخالف تصوف رجحان (شیخ) عبدالوہاب نجدی اور ہندوستان کے (سلفی) ''اہل حدیث'' میں بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ مولانا آزادؒ نے جب اسرارِ دین کو منکشف کرنا چاہا تو بالآخر ان کا نقطۂ نظر بھی تصوف اور دینیات کے میلانات کی ہم آہنگی کی جانب رہنما ہو گیا۔ کائنات کی مذہبی تشریح کرنے کی جو بھی کوشش کی جائے گی' اس کا متصوفانہ رنگ اختیار کر لینا کچھ ناگزیر سا نظر آتا ہے۔ اقبال بھی اپنے لیکچرز میں بالآخر ایک ''صوفی'' کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ عصری اسلامی مفکرین میں ''روایتی تصوف'' کا اقبال جیسا مخالف مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ مولانا آزاد نے بھی جا بجا ''شخصی مذہبی تجربے'' کی اہمیت پر زور دیا ہے اور بالآخر ان کا خیال بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں ابھرنے والے بے شمار سوالات کا جواب عقل و استدلال فراہم نہیں کر سکتا۔ محض شخصی تجربہ ہی ان کے حل کا واحد

ضامن ہے۔رحمت اور ربوبیت کے تصورات سے مولانا نے کئی مذہبی مباحث کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔تنزیہہ اور تجسیم، خدا کے صفات اور ان کا ذات سے ربط، انسان کا جبر و اختیار، کائنات میں انسان کا مقام، ہدایت و گمراہی کا قرآنی مفہوم، تقدیر کا اصلی منشا و مفہوم' یہ ایسے سوالات ہیں، جنھوں نے اسلامی فکر کی تاریخ میں بڑے ہنگامے برپا کیے۔مولانا کے نزدیک علماء اور مفسرین نے ان سوالات کا قرآنی حل تلاش کیا بلکہ ''وضعیت'' کا راستہ اختیار کیا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی فکر یونانی فلسفہ، منطق اور اخلاقیات میں الجھ کر رہ گئی۔قرآن نے ان سوالات کا فلسفیانہ یا استدلالی حل پیش نہیں کیا بلکہ ایک خالص ''انسانی'' یا (Humanistic) حل پیش کیا ہے جو انسان کی عملی زندگی میں عملی مشکلات پر قابو پانے اور کائنات میں ایک بلند تر مقام حاصل کرنے میں اس کی رہنمائی کر سکے۔سوال یہ نہیں ہے کہ مولانا کہاں تک بنیادی تضادات کو رفع کرنے میں کامیاب ہوئے۔ان سوالات کا کوئی مستقل حل انسانی ذہن فراہم نہیں کر سکتا۔ان کی نوعیت ''کھلے سوالات'' کی ہے اور صرف ایک کھلے ذہن ہی سے ان کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ایک انتہائی بلیغ حدیث ہے' جس کو مولانا نے بھی اپنے طرزِ استدلال کی حمایت میں پیش کیا ہے۔''**تفکروا فی خلق اللہ ولا تفکروا فی ذات اللہ**'' اس بلیغ حدیث سے اگر سائنس اور ایجابی علوم کے مطالعہ کے بے شمار امکانات وا ہو جاتے ہیں تو غیر ضروری اور اکثر صورتوں میں بے نتیجہ یا مابعد الطبیعیاتی سوالات کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔''**تفکر فی خلق اللہ**'' سائنس اور ایجابی علوم کا راستہ ہے اور ''**تفکر فی ذات اللہ**'' مدرسیت (Scholasticism) کا راستہ ہے' جس نے ایک عرصہ تک قرونِ وسطیٰ میں یورپ کی عیسائی دنیا کو ظلمت و اندھیرے میں بند رکھا تو آج تک مسلمان اور اسلامی دنیا فکری تکرار کے ختم نہ ہونے والے چکر میں گھری ہوئی ہے۔عصرِ حاضر کے دوسرے بڑے اسلامی مفکر اقبالؔ نے بھی یہی ایجابی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے اور یہ ایجابی نقطۂ نظر سائنس اور سماجی علوم کی حوصلہ افزائی کر سکتا ہے' بعض عصری مصنّفین نے غلطی سے اور چند سطحی مشابہتوں کی بنا پر جمال الدین افغانی اور مولانا آزاد کو ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔جمال الدین افغانی اپنی تصنیف ''ردّ مادیت'' کے ذریعہ بالآخر ایک غیر سائنسی بلکہ مخالف سائنس نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں اور اس تاریخی غلطی کے مرتکب ہو جاتے ہیں جس نے ایک عرصہ تک اسلامی دنیا کو اس پندارِ بے جا کا شکار کر رکھا ہے کہ مغرب مادہ پرست ہے اور مشرق روح پرست اور قدامت پسند۔افغانی نے یورپی استعمار پسندوں کے خلاف ''ابطالِ مادیت'' کو ایک تصوراتی حربے کے طور پر استعمال کیا۔اقبال بھی اپنے بنیادی موافق سائنس حکیمانہ نقطۂ نظر کے باوجود کبھی کبھی مغرب اور مشرق کے اس فرق کو زیادہ اہمیت دینے لگتے ہیں اور فکری حیثیت سے ''رجعت پسندی'' میں بھی گھر جاتے ہیں۔اس لحاظ سے آزاد کا مقام منفرد ہے۔انھوں نے نہ صرف ''ادیان'' کی وحدت کا سرور آفرین ترانہ چھیڑا اور خدا کی عالمگیر رحمت میں انسانیت کو متحد کرنے کی کوشش کی بلکہ مشرق اور مغرب کے اتحاد کی اساس بھی تلاش کی' ان میں نہ سرسید کا اعتداز ہے اور نہ شبلی کا پندار اور نہ اقبال کی مغرب کے خلاف کہیں کہیں پائی جانے والی مزاحمت۔سیاسی سوالات اور مغرب کے خلاف سیاسی کشمکش ان کے ذہن کو غبار آلود نہیں کرتی' جس طرح قدیم اور جدید ان کی فکر میں ایک بلند سطح پر متحدہ ہو جاتے ہیں، اسی طرح مشرق اور مغرب بھی ایک بلند سطح پر ایک ہو جاتے ہیں۔اسلام کی عالمگیری پر ان کا ایمان راسخ ہے، لیکن وہ اسلام کی عالمگیری ثابت کرنے کے لیے' جدید سیاسی' معاشی اور سماجی رجحانات اور تصورات سے الجھ نہیں پڑتے۔ان کے نزدیک اسلام کی عالمگیری نہ بدلنے یا بدل سکنے والے سیاسی، معاشی اور سماجی قوانین کا نام نہیں اور نہ ہی اس میں محدود ہے بلکہ اس عالمگیری کی اساس روحانی ہے۔انسان کی وحدت اور خدا کی توحید نہ

بدلنے والا اسلامی نقطۂ نظر ہے اور باقی سب فروع۔ مختصر یہ کہ غالب کا یہ شعر

ہم موحد ہیں ' ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں ' اجزائے ایماں ہوگئیں

آزاد کی فکری اساس ہے۔

(مطبوعہ: ''المعارف'' لاہور)

حواشی

(۱)''والذین جاھدو فینا لنھدینھم سبلنا '' (العنکبوت:۶۹)

(۲) ترجمان القرآن، دہلی ۱۹۳۱ء ج ا، ص ۵۷۔ یاد رہے کہ جب ترجمان القرآن ج ا کا دوسرا ایڈیشن اپریل ۱۹۴۷ء میں زمزم کمپنی نے لاہور سے شائع کیا تو اس میں جا بجا نئے مطالب کا اضافہ کیا گیا۔ یہ نیا ایڈیشن نقش ثانی ہے۔

(۳) ترجمان القرآن، ص ۷۶

(۴) ابوالکلام نے ۱۹۱۰ء میں سرمد پر اپنے مقالے میں لکھا تھا: ''اس کے (داراشکوہ) صاحب ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ تلاش مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی...... پروانہ کو تو شمع ڈھونڈنی چاہیے، اگر صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے تو سوزِ طلبی میں کامل نہیں۔'' سرمد کے بارے میں مولانا نے لکھا: ''سرمد جوشِ جنوں میں پھرتا ہوا جب شاہ جہاں آباد دہلی پہنچا تو قضا نے اشارہ کیا کہ قدم روک لیے جائیں کیوں کہ جس جام کی تلاش ہے، وہ اسی مے خانہ میں ملے گا۔ (ابوالکلام: ''حیات سرمد'' لکھنؤ، ص ۱۷)

(۵) ترجمان القرآن، ج ا، ص ۱۴۷۔ ۱۴۸ (۶) ترجمان القرآن، ج ا، ص ۱۴۰ (۷) ترجمان القرآن، ج ا، ص ۱۶۳

(۸) اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں قاہرہ میں شائع ہوا۔ جامع ازہر اور قدامت پسند حلقوں میں ہنگامہ بپا ہوگیا۔ مصنف کو اپنی ڈگری اور ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ علمائے الازہر اور شیخ الازہر نے اس کتاب پر سخت تنقید کی۔ بزم اقبال، لاہور نے ۱۹۹۵ء میں اس کتاب کا اردو ترجمہ ''اسلام اور اصول حکومت'' کے نام سے شائع کیا۔

زبان میری ہے بات اُن کی

ساغر اقبالی

☆ رحیم یار خان: بیٹی کو جہیز میں ۲۵۰ بوری گندم دی گئی۔ (ایک خبر)
موجودہ حالات میں اس سے بہتر تحفہ نہیں۔

☆ آٹے، بجلی، گیس کے بحران سے ق لیگ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ (شیر افگن)
بندہ ڈھیٹ ہونا چاہیے

☆ سابق وزیر اعظم شوکت عزیز اہلیہ کے ہمراہ لندن روانہ۔ (ایک خبر)
تماشا دکھا کر مداری گیا!

☆ آٹے کے بحران کے ذمہ دار بنگلوں میں ہیں، ہم گھنٹوں سے قطار میں کھڑے باری کے منتظر ہیں۔ (شہری)
میرے ادھر بھی آدمی ہیں اور ادھر بھی آدمی　　اِن کے جوتوں پر چمک ہے ان کے چہروں پر نہیں

☆ پاکستان کے ۸۷ اضلاع میں سالانہ آمدنی ۶۰۰۰ روپے یعنی ماہانہ ۵۰۰ روپے فی کس ہے۔ (ورلڈ فوڈ پروگرام اقوام متحدہ)
حکمران کہتے ہیں ہماری معیشت بہت مضبوط ہے، کوئی پرابلم ہی نہیں

☆ یہ لال حویلی نہیں، لال مسجد کا دور ہے۔ (جاوید ہاشمی)
پہلے ن لیگ تھا اب تو کچھ اور ہے

☆ صوبائی، قومی اور بین الاقوامی لوٹوں سے بھرے ہوئے کریٹ۔ (ایک تصویر)
ایک خریدیں، دوسرا مفت ملے گا۔

☆ آٹا ۳۰ روپے کلو تک جا پہنچا، عوام سرکاری تھیلوں کے لیے خوار۔ (ایک خبر)
لیناں دے وچ دھیاں بہناں　　آکھن گھی تے آٹا لیناں
اَگے مُنڈے پچھے مُنڈے　　نِت تماشا ویکھن غنڈے

☆ ملک کو جمہوریت نہیں، مخلص آمر کی ضرورت ہے۔ (نگران صوبائی وزیر اعجاز درانی)
ملک کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں؟

☆ آٹا بحران کے ذمہ دار عوام ہیں۔ (نگران وزیر خوراک)
شرم تم کو مگر نہیں آتی

☆ میں مردوں کے اشاروں پر نہیں رکتی۔ (ٹریفک اشارہ توڑنے پر ق لیگ کی مصباح کوکب کا اہلکار کو جواب)
اسی لیے حکومت نے چوکوں پر لیڈیز ٹریفک پولیس کھڑی کر دی ہے۔

ادارہ

اخبار الاحرار

مجلس احرار اسلام پاکستان کی سرگرمیاں

★ انتخاب مجلس احرار اسلام چیچہ وطنی:

چیچہ وطنی (۶ رجنوری) مجلس احرار اسلام چیچہ وطنی کا ایک انتخابی اجلاس گزشتہ روز بھائی محمد رشید چیمہ کی صدارت میں دفتر احرار میں منعقد ہوا جس میں دستور کے مطابق جدید رکنیت و معاونت سازی کی تکمیل کی گئی اور متفقہ طور پر خان محمد افضل کو امیر، بھائی محمد رشید چیمہ کو نائب امیر، حافظ محمد عابد مسعود ڈوگر کو ناظم، حافظ حبیب اللہ رشیدی کو نائب ناظم، حافظ حکیم محمد قاسم کو ناظم نشریات، قاضی عبدالقدیر کو معاون ناظم نشریات، مولانا منظور احمد کو ناظم دعوت وارشاد، محمد ارشد کو ناظم مالیات، سید رمیز احمد کو میڈیا انچارج اور شہزاد انجم کھوکھر ایڈووکیٹ کو قانونی مشیر منتخب کر لیا گیا۔ جب کہ مرکزی ناظم نشریات عبداللطیف خالد چیمہ مرکزِ احرار کے مدیر منتظم اور قاری محمد قاسم معاون مدیر منتظم مقرر کیے گئے۔ اجلاس میں مقامی مجلس شوریٰ بھی منتخب کی گئی اور مرکزی مجلس شوریٰ کے لیے مرکزی نمائندگان مقرر کیے گئے۔ علاوہ ازیں اجلاس میں حلقہ غازی آباد کے لیے الگ یونٹ تشکیل دیا گیا جس کے امیر ڈاکٹر عبدالرحیم اور ناظم مولانا شاہد محمود احمد منتخب ہوئے۔ اجلاس میں مجلس احرار اسلام کے کارکن حافظ محمد فاروق اسلم (جو گزشتہ دنوں ایک حادثہ میں انتقال کر گئے تھے) کے لیے فاتحہ خوانی اور دعا مغفرت کی گئی۔ اجلاس میں حلقہ معاونین کو شہر اور مضافات میں منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اجلاس میں بڑھتی ہوئی کمر توڑ مہنگائی اور گرانی، بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ، آٹے کی عدم دستیابی پر شدید بے چینی کا اظہار کیا گیا۔ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے بے نظیر بھٹو کے سفاکانہ قتل کی بھی شدید الفاظ میں مذمت کی گئی اور ملک کی بگڑی ہوئی سیاسی واقتصادی اور معاشی صورتحال کی ذمہ داری پرویز حکومت پر عائد کی گئی۔ اجلاس میں کہا گیا کہ پرویز حکومت کے متعدد اقدامات فیصلوں اور پالیسیوں کے نتیجے میں علیحدگی پسندی کی تحریکات کو تقویت مل رہی ہے اور دین وملک دشمن عناصر کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ اجلاس میں ملک بھر میں بڑھتی ہوئی قادیانی ریشہ دوانیوں پر بھی گہری تشویش کا اظہار کیا گیا۔

☆☆☆

چیچہ وطنی (۶ رجنوری) شبانِ احرار اور تحریک طلباء اسلام چیچہ وطنی کا ایک ہنگامی اجلاس رانا محمد عمیر قمر کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں رانا محمد زبیر قمر، حافظ محمد مغیرہ، محمد قاسم چیمہ، محمد نعمان چیمہ اور دیگر طلباء نے شرکت کی۔ اجلاس میں متفقہ طور پر رانا محمد عمیر قمر کو علاقائی کنوینر منتخب کیا گیا اور ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جو مدارس دینیہ اور سکولوں، کالجوں میں دینی شعور کی بیداری کے لیے شبانِ احرار اور تحریک طلباء اسلام کے کام اور تنظیم سازی کے عمل کو منظم کر کے آئندہ اجلاس میں رپورٹ پیش کرے گی۔

☆☆☆

لاہور (۱۸ رجنوری) انڈیا میں قادیانیوں کا سالانہ اجتماع بری طرح ناکام ہو گیا، مجلس احرار اسلام ہند کی کوششوں

کے نتیجے میں قادیانیوں کے دعوؤں کی قلعی کھل گئی۔ جب ہزاروں افراد کی شرکت کا دعویٰ کرنے والی قادیانی جماعت کو بری طرح ناکامی اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مجلس احرار اسلام ہند کے جنرل سیکرٹری محمد عثمان رحمانی لدھیانوی نے پاکستان میں مجلس احرار اسلام کے سیکرٹری اطلاعات عبداللطیف خالد چیمہ کو فون پر بتایا ہے کہ گزشتہ دنوں قادیان میں ہونے والے سالانہ اجتماع کے لیے پورے ملک میں قادیانی جماعت نے وسائل اور پراپیگنڈے کے بل بوتے پر وسیع مہم چلائی اور مرزا قادیانی کی جھوٹی نبوت کو اسلام کے لبادے میں چھپا عوام کو دھوکہ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ لدھیانہ سے آنے والی اطلاعات کے مطابق گزشتہ پانچ سال سے لگاتار مجلس احرار اسلام کی برپا کردہ تحریک تحفظ ختم نبوت کے رضا کاروں کی دن رات کی کوششوں سے قادیانی اجتماع مسلسل ناکامیوں اور نامرادیوں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس مرتبہ اجتماع کچھ زیادہ ہی ویران نظر آ رہا تھا۔ جب کہ بھارتی میڈیا نے بھی اس مرتبہ قادیانی اجتماع کی کوریج کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ مجلس احرار اسلام کے رضا کاروں کی محنت کے نتیجے میں بھولے بھالے مسلمان اور غریب لوگ بھی اس مرتبہ شریک نہیں ہوئے جن کو بہلا پھسلا کر قادیانی لگژری کوچوں کے ذریعے اجتماع گاہ لے آتے تھے۔ اس طرح ہر قسم کی سہولتوں اور انعامات سے نوازنے کے اعلانات کے باوجود جلسہ گاہ ویرانی کا شکار تھی اور ہر طرف اداسی چھائی تھی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ چند سال قبل تک پنجاب کی کئی سیاسی جماعتوں کے لیڈر اپنے مفاد کے لیے قادیان کے سالانہ جلسہ میں شریک ہوا کرتے تھے، لیکن مجلس احرارِ اسلام ہند کے قومی صدر مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانوی کی جانب سے دو سال قبل واضح اور دوٹوک اعلان کے بعد جو سیاسی جماعت قادیانیوں کا ساتھ دے گی یا ان کے ساتھ نرم گوشہ رکھے گی، مسلمان کمیونٹی اسے اپنا مخالف اور قادیانیوں کا دوست تصور کرے گی اور الیکشن میں قادیانی نواز جماعت یا امیدواروں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے گا۔ اس طرح سیاسی جماعتوں نے بھی قادیانیوں سے منہ پھیر لیا۔ کیوں کہ پنجاب بھر میں لاکھوں مسلمانوں کا مضبوط ووٹ بنک ہے۔ آمدہ اطلاعات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قادیانی جلسہ گاہ کا ایک گوشہ قادیانیوں کا میڈیا سیکشن تھا۔ جہاں قادیانی میڈیا ٹیم کمپیوٹرز پر دیگر سیاسی جماعتوں کے اجتماع کی تصویروں کو کاٹ کر قادیانی اجتماع کے شرکاء ظاہر کر رہی تھی، لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ اس کیمرہ ٹیکنیک کے باوجود بھارتی اخبارات نے قادیانی تصویروں کو شائع نہیں کیا، کیوں کہ مجلس احرار اسلام پہلے ہی قومی و علاقائی اخبارات اور میڈیا کو اس صورت حال سے آگاہ کر چکی تھی۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اخبارات کے نمائندگان نے بھی قادیانی اجتماع کو کوئی اہمیت نہیں دی اور بتایا گیا ہے کہ جھوٹی نبوت کے پیروکاروں کو اس سالانہ جلسہ میں ایک مرتبہ جھٹکا اس وقت بھی لگا جب ریلوے انڈیا نے امرتسر سے قادیانی اجتماع کے لیے اسپیشل ٹرین چلانے سے انکار کر دیا کہ گزشتہ سال اس مقصد کے لیے چلائی گئی اسپیشل ٹرین میں کوشش کے باوجود مرزائیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی، جس کی خبریں مقامی اخبارات میں چھپ گئی تھی اور جلسہ کے لیے چلائی گئی میلہ ایکسپریس تقریباً خالی قادیان گئی تھی۔ امیر احرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے کہا ہے کہ اُن کی سیاست بھی دین کے تابع ہے اور ہمارے لیے اہم ترین مسئلہ تحفظِ ختم نبوت ہے۔ ہم عقیدۂ ختم نبوت کی حفاظت کے لیے صرف پنجاب میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں اکابرِ احرار کی روایات کو زندہ کریں گے اور ختم نبوت کا پرچم لہرا کے رہیں گے۔

☆☆☆

چیچہ وطنی (۲۰ر جنوری) یومِ عاشور کے موقع پر دفتر مجلس احرار اسلام جامع مسجد چیچہ وطنی میں شہداء محرم الحرام کے ایصالِ ثواب کے لیے ایک خصوصی نشست عبداللطیف خالد چیمہ کی زیر صدارت منعقد ہوئی جس میں مہمانِ خصوصی پروفیسر محمود احمد محمود تھے۔ مرکزی مسجد عثمانیہ کے خطیب مولانا منظور احمد نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سیدنا حضرت فاروقِ اعظم اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسی جلیل القدر ہستیوں کی شہادتوں نے امت کو زندگی عطا کی۔ انھوں نے کہا کہ محرم الحرام کا مہینہ انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف حوالوں سے بڑی نسبتوں والا مہینہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہر اسلام دشمن تحریک کے پیچھے یہودیت وسبائیت کا خفیہ ہاتھ کارفرما ہے۔ انھوں نے کہا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام کے تمام صحابہ کرام ستاروں کی مانند ہیں اور ہمارے لیے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم دشمن کی چالوں کو سمجھ کر دین مبین پر عمل کرنے والے بن جائیں۔

☆☆☆

چیچہ وطنی (۲۰ر جنوری) مجلس احرار اسلام چیچہ وطنی کے ناظم نشریات حکیم محمد قاسم اور قاضی عبدالقدیر نے پی ٹی سی ایل کے اس اقدام پر کہ ”شام ۴ بجے سے صبح ۸ بجے تک“ جو لوکل کال کی جائے اس کا دورانیہ ایک منٹ سے ایک گھنٹہ تک ہونے کی صورت میں تقریباً ۴ روپے ۸۹ پیسے فی کال وصول کیے جائیں گے پر شدید احتجاج کیا ہے اور اس جبری مسلط کیے گئے لوکل کال ریٹ کو ظالمانہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پی ٹی سی ایل نے اس لوکل کال ریٹ کے لیے جو اشتہار دیا ہے، اس سے صارفین کو یہ پتا نہیں چلتا کہ ایک دو منٹ کی کال بھی انھیں تقریباً چار روپے انانوے روپے (۴.۸۹) میں پڑتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس مغالطے سے ٹیلی فون کے عام صارفین پر غیر ضروری بوجھ پڑے گا جو سراسر زیادتی ہے، لہٰذا اسے بلا تاخیر واپس لیا جائے۔

☆☆☆

چیچہ وطنی (۲۵ر جنوری) ممتاز مذہبی سکالر حکیم محمود احمد ظفر نے کہا ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت تاریخ کا المناک باب ہے، لیکن اس المناک باب کے اصل محرکات کو صدیوں سے چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے اور یہ سب کچھ اسلام کے ازلی دشمنوں یہودیت وسبائیت کی سازشوں کے ذریعے سے پروان چڑھا اور پیشہ ور واعظین نے اپنے دھندے چلانے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی مقدس جماعت کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا، حالانکہ تمام کے تمام صحابہ کرام جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کی روشنی میں تنقید سے مبرّا، ہدایت یافتہ اور ستاروں کی مانند ہیں۔ وہ مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام مرکزی مسجد عثمانیہ ہاؤسنگ سکیم چیچہ وطنی میں سالانہ مجلس ذکر حسین رضی اللہ عنہ کے بڑے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ حکیم محمود احمد ظفر نے کہا کہ عبداللہ ابن سبا کی یہودیانہ سازشوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے مسلمانوں ہی کی مقدس ہستیوں کا نام استعمال کیا، لیکن افسوس کہ علماء کرام اور میڈیا عوام کو حقیقتِ حال بنانے کی بجائے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر سبائی سازشوں کا شکار ہو کر امت کے چودہ سو سالہ متفقہ عقائد کو برباد کر رہے ہیں۔ انھوں نے خواص وعوام سے اپیل کی کہ وہ ظہورِ اسلام اور خلافتِ صحابہ کے خلاف ہونے والی سازشوں کا حقیقی ادارک کریں اور صحیح الفکر کتب سے رہنمائی

حاصل کر کے اپنے حقیقی دشمن کو پہچانیں۔ تقریب سے حافظ محمد عابد مسعود ڈوگر نے بھی خطاب کیا۔ بعد ازاں احرار لائبریری ہال جامع مسجد چیچہ وطنی میں سوال و جواب کی ایک نشست بھی منعقد ہوئی۔

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ حق پر تھے، اُن سے محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے: (سید عطاء المہیمن بخاری)

ملتان (۲۰ر جنوری) مجلس احرار اسلام کے زیر اہتمام چونتیسویں سالانہ مجلس ذکر حسین (رضی اللہ عنہ) ۱۰ر محرم کو دارِ بنی ہاشم میں منعقد ہوئی۔ مجلس ذکرِ حسین سے امیر احرار حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری اور سید محمد کفیل بخاری نے خطاب کیا۔ حضرت سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: حادثۂ کربلا پر ہمارا مؤقف بالکل واضح اور جمہور علماء کے مؤقف کے مطابق ہے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ نواسۂ رسول اور صحابی ہیں اور یزید، تابعی۔ سیدنا حسین کا مقام و مرتبہ اتنا بلند ہے کہ یزید کا اُن سے کوئی تقابل نہیں۔ ہر صحابی مجتہدِ مطلق ہے۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا اجتہاد برحق ہے۔ انھوں نے یزید کے خلاف جہاد کا کہیں اعلان نہیں فرمایا۔ کوفہ کے منافقین نے یزید کی حکومت کے خلاف جو شکایات خطوط کے ذریعے بھیجیں، اُن کا جائزہ لینے اور اصلاحِ احوال کے لیے انھوں نے سفر کیا۔ جب اصل صورتِ حال سامنے آئی اور جھوٹ کا پول کھلا تو آپ نے تین شرائط پیش فرما دیں:

(۱)　مجھے واپس جانے دو۔

(۲)　مجھے یزید کے پاس جانے دو تا کہ میں اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے دوں۔

(۳)　مجھے اسلامی سرحدات پر یا ترکی کی سرحد پر بھیج دو تا کہ میں وہاں کفار سے جہاد کروں۔

یہ تینوں شرائط تاریخ کی (سُنی و شیعہ) تمام بڑی کتابوں میں موجود ہیں۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی ان شرائط کے بعد واقعہ کربلا اور اس کے پس منظر میں اصل سازش اور سازشی کرداروں کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ یہ مسئلہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، عقیدے سے نہیں۔ ہمارا مؤقف یہ ہے کہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ حق پر تھے اور انھیں شہید کرنے والے ظالم۔ مگر اس ظلم کا ذمہ دار اُسی کو ٹھہرایا جائے جس نے کیا۔ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے محبت، اُن کا حق پر ہونا ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔

★ انتخاب مجلس احرار اسلام چناب نگر:

محمد زکریا قریشی (سرپرست)، مولانا محمد مغیرہ (امیر)، ماسٹر احمد علی (نائب امیر)، حافظ محمد صدیق (نائب امیر)
احمد ریاض (ناظم)، ڈاکٹر محمد سرور (نائب ناظم)، جعفر علی (نائب ناظم)، عبدالمجید (ناظم نشریات)، عمران حیدر (ناظم نشریات)
مجلس شوریٰ: مولانا محمد مغیرہ، احمد ریاض، محمد اظہر

★ انتخاب مجلس احرار اسلام سلانوالی (ضلع سرگودھا):

محمد ذیشان (امیر)، زاہد معاویہ (ناظم)، ندیم معاویہ (ناظم نشریات)، عبدالقدیر (رکن شوریٰ)

★ انتخاب مجلس احرار اسلام ساہیوال:

مولانا محمد صفدر عباس (امیر)، مولانا طالب حسین (نائب امیر)، محمد عتیق صدیق (ناظم)، حافظ محمد معاویہ ارشد (ناظم نشریات)

★ مجلس احرار اسلام شہلی غربی (حاصل پور):

حافظ محمد انور (امیر)، حافظ مشتاق احمد (نائب امیر)، مولوی محمد اسماعیل (ناظم)، حافظ محمد مغیرہ (ناظم نشریات)

★ انتخاب مجلس احرار اسلام پرو چڑاں (تحصیل خان پور ضلع رحیم یار خان):

حاجی محمد یعقوب (صدر)، عبدالغفار (نائب صدر)، محمد زاہد مدنی (نائب صدر)، محمد افضل (ناظم)، عبدالوہاب (نائب ناظم) عطاء المنعم (ناظم نشریات)

مسافرانِ آخرت

★ مدرسہ معمورہ ملتان کے سفیر اور مجلس احرار اسلام کے کارکن ابو معاویہ محمد بشیر چغتائی کی اہلیہ مرحومہ

★ مجلس احرار اسلام لاہور کے ناظم قاری محمد یوسف احرار کی خوش دامن صاحبہ

★ مجیدیہ کتب خانہ ملتان کے مدیر حافظ بلال احمد رحمہ اللہ (مرحوم جامعہ خیر المدارس ملتان کے سابق شیخ الحدیث حضرت مفتی محمد عبداللہ رحمہ اللہ کے فرزند تھے)

★ مجلس احرار اسلام اوکاڑہ کے رہنما شیخ مظہر سعید کی خوش دامن اور شیخ انعام اللہ کی والدہ محترمہ، انتقال: ۲۶ر جنوری لاہور

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ (ادارہ)

بیاد مجدد بنی ہاشم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ـــــ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ

مدرسہ معمورہ

بانی
سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ
قائم شدہ
28 نومبر 1961ء

دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان

الحمدللہ

مدرسہ معمورہ اپنے تعلیمی وفکری سفر پر گامزن ہے اور تسلسل کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ طلباء کے لیے مدرسہ معمورہ اور طالبات کے لیے جامعہ بستانِ عائشہ میں حفظ وناظرہ قرآن، درسِ نظامی اور پرائمری ومڈل شعبوں میں تعلیم جاری ہے۔

- دارالقرآن
- دارالحدیث
- دارالمطالعہ
- دارالاقامہ

کی تعمیر میں حصہ لیں

طلباء کی درس گاہوں، رہائش، دفتر اور لائبریری کے لیے 24 کمروں پر مشتمل دومنزلہ عمارت کی تعمیر شروع کی جارہی ہے۔ لاگت فی کمرہ دولاکھ پچاس ہزار روپے ہے۔ صدقہ جاریہ میں حصہ لیں اور نقدوسامانِ تعمیر دونوں صورتوں میں تعاون فرما کر اجر حاصل کریں۔

ترسیل زر

بذریعہ بینک: چیک یا ڈرافٹ بنام سید محمد کفیل بخاری مدرسہ معمورہ
کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 2-3017 یو بی ایل کچہری روڈ ملتان
بذریعہ آن لائن: 2-3017-010 بینک کوڈ: 0165

رابطہ
061 - 4511961
0300-6326621
majlisahrar@yahoo.com
majlisahrar@hotmail.com

الداعی الی الخیر ابن امیر شریعت سید عطاء المہیمن بخاری
امیر
مجلس احرار اسلام
پاکستان

Monthly "Naqeeb-e-Khatm-e-Nabuwwat" Multan. Regd. M. No: 32

اسلام کے نام ور سپوت
تحریک آزادی کے عظیم مجاہد
فدائے احرار

مولانا محمد گل شیر شہید رحمۃ اللہ علیہ

نیا ایڈیشن اضافوں کے ساتھ

- سوانح وافکار
- احوال وآثار
- سیرت وکردار
- بے مثال جدوجہد

نوجوان محقق **محمد عمر فاروق** کے قلم سے ایک **تاریخی دستاویز**

جب برطانوی سامراج کا آفتاب نصف النہار پر تھا

★ انقلاب زندہ باد کہنے سے انگریز اور اس کے جانشینوں کی ہڈیاں ان کی قبروں میں چٹخنے لگتی تھیں۔

★ راست باز زبانوں کے لیے اندھا قانون اور بے خوف انسانوں کے لیے کوڑھی انصاف تھا۔

★ کاسہ لیسانِ سرمدی اپنے سینوں پر تمغہ ہائے وفاداری لٹکائے پھرتے تھے۔

★ فدایانِ حریت کے لیے حلقہ ہائے زنجیر تھے یا درّہ ہائے تعزیر

★ طلبگارانِ آزادی کی بے سروسامانی پر فرزندانِ سلطنت کے وحشیانہ قہقہے گونجتے تھے۔

★ احرار رضاکاروں کے بدن کا گوشت روئی کے گالوں کی طرح اڑتا تھا۔

★ پیکرانِ عفت کے چہروں پر طمانچوں کی مہریں ثبت تھیں

یہ اِنہی دنوں کی سرگزشت ہے

مقدمہ نگار

- حضرت خواجہ خان محمد مدظلہ
- مولانا سید عطاء المحسن بخاریؒ
- مولانا محمد سعید الرحمٰن علویؒ

فلیپ نگار

- مولانا محمد اسحاق بھٹی
- عبداللہ عظیمی
- احمد ندیم قاسمی
- ڈاکٹر انور سدید

نایاب اخباری وسرکاری ریکارڈ سے ماخوذ دستاویزات

- مکاتیب وعکس تحریر
- نادر ونایاب تصاویر
- تاریخی منظومات
- نام ور شخصیات کا اعتراف عظمت
- انگریزوں کے پیشینی وفاداروں کی خدمات
- اعزازات، خطابات اور زمینوں کی تفصیلات
- مجاہدین آزادی کی خونچکاں سرگزشت
- سینکڑوں عنوانات کے گرد گھومتی کہانی
- مؤلف کی دس سالہ محنت کا نچوڑ
- تاریخ کے سربستہ راز اور ان کہی کہانیاں، پہلی مرتبہ منظر عام پر

کمپیوٹر کتابت | خوبصورت سرورق | اعلیٰ طباعت

قیمت:-/250 روپے | صفحات 504

رابطہ بخاری اکیڈمی دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی، ملتان 061-4511961

Designed by 0321-6358191